شیخ اسماعیل
ڈھلتا سورج

ڈھلتا سورج

اور

دوسرے افسانے

شیخ اسماعیل

موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی نے کوکن اردو
رائٹرز گلڈ شاخ نیروبی (کینیا) کے لیے نعمانی آفسیٹ
پریس دہلی میں طبع کرا کے شائع کیا۔

DHALTA-SOORAJ (SHORT STORIES) BY SHEIKH ISMAIL PRICE RS-30/-

ڈھلتا سورج

(افسانے)

شیخ اسماعیل
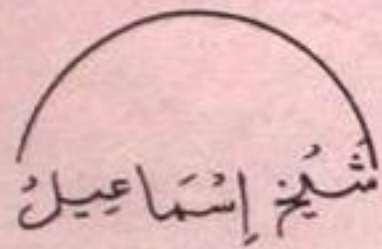
پوسٹ بکس نمبر ۲۶۰۵۴
نیروبی (کینیا)

پہلی بار: اکتوبر ۱۹۸۷ء

قیمت: تیس روپے

کتابت: جمال گیاوی

سرورق: رزاق ارشد

طباعت: اے ون آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی

باختیار تقسیم کار:

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹، گولامارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
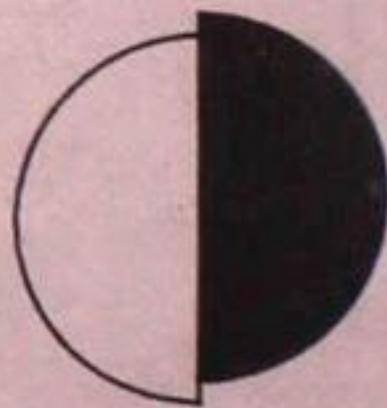
اپنے مرحوم چچا

شیخ حسن شیخ احمد میکر

کے نام

جو زندگی بھر مجھے اپنی پدرانہ شفقتوں سے نوازتے رہے

——— شیخ اسماعیل

ترتیب

افسانے

تعارف

کوکن اردو رائٹرز گلڈ (شاخ نیروبی) کینیا

"نیم شگفتہ" اور "وقت کا سورج" کے خالق اور مشرقی افریقہ میں مقیم کوکن کے بے لوث اور مخلص خدمت گار اور شاعر جناب ساحر شیوی کی تحریک اور ذاتی مالی تعاون سے ۱۹۶۸ء میں کوکن اردو رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا۔ گلڈ کے بنیادی اور ترجیحی مقاصد میں کوکن کے اردو ادبا و شعرا کی ہمت افزائی اور ان کی ادبی خدمات کو اردو دنیا سے متعارف کرانا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں اس پروگرام کے تحت ادارے نے داؤد غازی مرحوم کا شعری مجموعہ "وقت کی صدیاں" زیورِ طبع سے آراستہ کرایا، لیکن افسوس کہ یہ ادارہ زیادہ دن سرگرم نہیں رہ سکا۔ کچھ احباب کی بے نیازی اور آپسی کشمکش کے باعث اس پر جمود طاری ہو گیا اور کوئی دوسری کتاب

منظرِ عام پر نہ آسکی۔ لیکن ساحرؔ شیوی نے ہمت نہیں ہاری اور اس میں پیدا شدہ تعطّل کو ختم کرنے کے لیے وہ ہمہ وقت مصروف اور منہمک رہے۔ بالآخر موصوف کی کوششیں بار آور ہوئیں اور ۱۹۸۰ء میں کینیا (مشرقی افریقہ) کی راجدھانی نیروبی میں از سرِ نو ادارے کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا گیا۔ یہاں ساحرؔ کو مقامی ادب نواز دوستوں اور کرم فرماؤں کا بھرپور تعاون حاصل ہوا اور نئے ولولے اور جوش کے ساتھ پروگرام کی ابتدا ہوئی۔ ادارے کی تنظیمِ نو کے بعد مندرجۂ ذیل کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکی ہیں جن کی اردو دنیا میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہے۔

شعاعِ اوّل / مہر ورولوی مرحوم (۱۹۸۱ء) مہاراشٹر کی تہذیبی و ادبی قدریں / بدیع الزماں خاور (۱۹۸۲ء) لہو کے چراغ / انجم عبّاسی، چہرکر / شاکر بانکوٹی (دونوں ۱۹۸۴ء) لمحے لمحے کا کرب / پرویز باغی اور مرآۃ المعرفت / عارف سیمابی بانکوٹی (دونوں ۱۹۸۵ء) نئی تحریریں / ڈاکٹر عبدالستار دلوی (۱۹۸۶ء) کوکن کے سپوت / انجم عبّاسی / شیخ اسماعیل (۱۹۸۶ء) اردو کہاوتیں اور اُن کے سماجی و لسانی پہلو / ڈاکٹر یونس اگاسکر (۱۹۸۷ء) ڈھلتا سورج / شیخ اسماعیل (۱۹۸۷ء) ان میں سے اوّل الذکر دو کتابیں نقشِ کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ بمبئی کے توسط سے اور بقیہ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں جناب عبّاس میاں کر دیکر کی نصیحت آموز کہانیاں "صدف موتی" بھی گلڈ کی نیروبی شاخ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

شیخ اسماعیل

سکریٹری

مہاراشٹر کا مغربی کنارہ جو کوکن کے نام سے منسوب ہے۔ تین اضلاع پر مشتمل ایک خطہ ہے۔ اسی خطہ کے ضلع رتنا گیری کے ایک چھوٹے سے گاؤں نیسہ میں جناب شیخ اسماعیل محمد علی نیسیکر نے ۲۰ را کتوبر ۱۹۳۱ء کو آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں نیسہ اور کھیڈ میں پائی۔ ثانوی تعلیم قریبی گاؤں کھیڈ، فردس اور داپولی میں حاصل کی۔ ناسازگار ماحول اور

معاشی طور پر نامساعد حالات نے انھیں مشرقی افریقہ کی جانب رخ کرنے پر مجبور کیا۔ ۱۹۴۸ء میں عم محترم مرحوم شیخ حسن کی وساطت سے سرزمین افریقہ پر قدم رکھا۔ مشرقی افریقہ میں ان کا قیام زیادہ تر نیروبی میں رہا اور وہیں انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ نیروبی کے گورنمنٹ انڈین ہائی اسکول (اب جمہوری ہائی اسکول) سے سینیئر کیمبرج اور لندن میٹرک کے امتحانات پاس کیے۔ یہاں آپ کو انڈو پاک کے معروف ادیب پروفیسر جوگند رپال کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔

۱۹۵۱ء میں ایسٹ افریقن پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف ایڈمنسٹریشن میں بحیثیت کلرک ملازمت اختیار کی۔ اس عہد کے حالات کو خود شیخ اسماعیل صاحب اپنی کہانی "ڈھلتا سورج" میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"ایک انگریز افسر اور چند افریقی چپراسیوں اور قلیوں کے علاوہ ہر آفس کا تقریباً سارا عملہ ایشیائی ہوا کرتا تھا۔ یہ صرف محکمۂ ڈاک بلکہ ہر سرکاری دفتر کا یہی ڈھانچہ ہوا کرتا تھا۔ سول سروس میں ایشیائی کچھ ایسا مرکزی کردار ادا کیا کرتے تھے کہ انھیں "ریڑھ کی ہڈی" کی حیثیت حاصل تھی..."

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"ہر آفس کا ایک انچارج ہوا کرتا تھا اور وہ ہر حالت میں انگریز ہی ہوتا، خواہ وہ کتنا ہی نکما کیوں نہ ہو..."

سامراجی حکومت ہو اور سرکاری مشینری کی پوری عمارت نسلی امتیاز پر کھڑی ہو تو کبھی کبھی سول سرونٹ کا دم گھٹ کے رہ جانا ایک فطرتی امر ہے

جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی ترقی کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں تو وہ اپنی روزی کے مسئلہ کے حل کی تلاش میں کسی اور راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے کے مصداق شیخ اسماعیل صاحب صحافت کی جانب مائل ہوئے۔ دن بھر محکمہ ڈاک میں کلرکی کرتے اور فرصت کے اوقات میں مشرقی افریقہ کے قدیم ترین روزنامہ "اسٹنڈرڈ" STANDARD کے اسپورٹس کالم کے لیے لکھتے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کا شمار ملک کے معتبر، قابل قدر اور انتہائی کامیاب اسپورٹس رپورٹرس میں ہونے لگا۔

۱۲؍دسمبر ۱۹۶۳ء کو کینیا (مشرقی افریقہ) کو انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی۔ ایک ایک کر کے "افسران" جب اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن (برطانیہ) واپس جانے لگے تو خالی شدہ جگہوں میں سے ایک جگہ پُر کرنے کے لیے شیخ اسماعیل صاحب کو نامزد کیا گیا۔ اس کے بعد آپ نے مڑکر پیچھے نہیں دیکھا۔ ترقی کے زینے کچھ اس تیز رفتاری سے چڑھتے گئے کہ چند ہی سالوں میں کینیا، یوگانڈا، اور تانزانیا ان تینوں ممالک کے پوسٹ آفس انویسٹی گیشن INVESTIGATION ڈیپارٹمنٹ کے افسر اعلیٰ کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ تقریباً سات سال تک سینئیر انویسٹی گیشن آفیسر SENIOR INVESTIGATION OFFICER کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد آپ ۱۹۷۶ء میں ریٹائر ہوئے۔ آج کل اپنے ذاتی کاروبار میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ روزانہ اسپورٹس رپورٹنگ کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ اس درمیان تقریباً پانچ سال تک آپ لاہور (پاکستان) سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ "اسپورٹس ٹائمس" (SPORTS TIMES) کے نامہ نگار برائے

مشرقی افریقہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ چند سالوں سے مشرقی افریقہ میں ماہنامہ "نقشِ کوکن" بمبئی کے نامہ نگار بھی ہیں۔ کوکن اردو رائٹرز گلڈ (نیروبی شاخ) کے جنرل سیکریٹری ہیں اور اس کا سارا بار اپنے سر پر اٹھایا ہے۔ میری اپنی ہستی اُن کے بغیر ایک ڈوبتی ناؤ جیسی رہے۔ ترقی و ترویج میں نہایت خوش اسلوبی سے اپنے فرض کو انجام دینے میں کوشاں ہیں۔

آپ کو اردو زبان پر بھی اچھی خاصی دسترس حاصل ہے۔ اور کبھی کبھار کہانیاں یا افسانے لکھ لیتے ہیں۔ آپ کی بالکل سادہ اور سلیس زبان میں لکھی ہوئی جو متعدد کہانیاں وقتاً فوقتاً "نقشِ کوکن" میں چھپتی رہی ہیں۔ وہ آپ کے مشرقی افریقہ کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی عکاسی کرتی ہیں۔

—— ساحر شیوی

شیخ اسماعیل صاحب کی مختصر کہانیوں کے مجموعہ
پر لکھنا میرے لیے دوہری خوشی کا باعث ہے ـــــــ
ایک تو اس لیے کہ کوئی ڈیڑھ دو سال پہلے جب وہ مجھ
سے اپنی مرتب کردہ کتاب 'کوکن کے سپوت' سے متعلق
گفتگو کر رہے تھے اس وقت مجھے محسوس ہوا تھا کہ ان کی

توجہ بالخصوص میرے اس جملہ پر مرکوز تھی جس میں میں نے ہونہار ادیبوں سے درخواست کی تھی کہ وہ با مقصد تحقیقی نثر کی طرف اپنی استعداد کا تصرف کریں۔ دوسری اس لیے کہ سرزمین کینیا پر اس قدر اصلاحی اور شستہ خیالات پر مبنی اردو کہانیاں لکھنے اور ان کی طباعت و اشاعت کا سہرا ایک کوئنی سپوت کے سر بندھا۔

کینیا کی آزادی سے پہلے اس ملک میں ایشیائی باشندوں کی آبادی تقریباً دو لاکھ تھی۔ جس میں اردو لکھنے اور بولنے والوں کا تناسب پچاس فیصد ہوگا۔ بھاری اکثریت پنجابی مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی تھی۔ اس تھوڑی سی تعداد میں اردو کے ایسے صحافی، شعرا اور نثر نگار پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف افریقہ بلکہ ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں جگہ پائی۔ میرے ذہن میں دو نام خاص طور پر آتے ہیں: کالی داس گپتا رضا اور جوگندر پال۔ اول الذکر نے اردو کے تحقیقی میدان میں خوب اپنا لوہا منوایا اور اب بھی منوا رہے ہیں۔ مشرقی افریقہ کے اپنے قیام کے دوران وہ میرے قریبی عزیزوں میں شامل رہے ہیں۔ جوگندر پال صاحب کے افسانے ہند و پاکستان کے مشہور جریدوں میں چھپتے رہے ہیں اور جانے مانے افسانہ نویسوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ مشرقی افریقہ کی آزادی سے پہلے کے افریقی

ماحول اور موضوعات پر لکھی ہوئی ان کی بہت سی خوبصورت کہانیاں میری نظر سے گزری ہیں۔ یہ دیکھ کر یک گونہ مسرت اور تسکین حاصل ہوتی رہے کہ اس ملک میں مٹھی بھر ایشیائیوں نے کتنے بلند پایہ لوگ پیدا کیے۔

اس دور کے کوکنی مسلمانوں میں صرف ساحر شیوی کا نام سرفہرست آتا تھا۔ شیخ صاحب اس وقت معاشی کشمکش میں مبتلا تھے، پھر بھی اپنی تمام تر قوتیں سماجی کاموں میں صرف کررہے تھے۔ موصوف انگریزی صحافت میں کھیل کود کے کالم کے ذریعہ منظرِ عام پر آئے۔ اس وقت کینیا کے مشہور روزنامہ "اسٹینڈرڈ" میں کھیلوں پر ان کے تبصرے بڑے اشتیاق سے پڑھے جاتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ معاشی دباؤ سے فراغت پانے کے بعد انھوں نے ادب کی جانب بھی رُخ کیا اور پورے خلوص کے ساتھ، نتیجتہً ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہمارے سامنے ہے ——— اس وقت آزاد کینیا کی سرزمین پر موجود ایشیائیوں میں اللہ کے فضل وکرم سے کوکنی مسلمانوں کے نام ہر فن اور پیشہ میں سرفہرست ہوتے ہیں۔ یہ معاشی خوشحالی اور تعلیم کے عام ہونے کی وجہ سے قومی اور معاشرتی تگ ودو میں دوسری ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بشانہ چلتے نظر آتے ہیں۔ موجودہ نسل کو ماضی کے اس احساسِ کمتری کی زنجیر کا علم تک نہیں ہے، جس میں

اسلاف پہلے جکڑے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ایک ایسی نئی اور روشن دنیا ہے ـــــ جس کی بنیاد دینِ اسلام کی باصحت اور قرآنی اقدار پر ہے۔ افریقی تجربات کے پس منظر میں لکھی ہوئی ان کی کہانیاں اسلامی اور ایشیائی طرزِ زندگی، جو کینیا میں رہی ہے، کی بہترین عکاس ہیں اور ان میں اصلاحی پہلو بھی پائے جاتے ہیں۔ شیخ صاحب کی اس کتاب کی رونمائی پر ہم سب کو فخر ہے اور دعاگو ہیں کہ ان کے ایسے متعدد مجموعے منظرِ عام پر آئیں۔ آمین!

آیئے اب اس مجموعے میں شامل چند کہانیوں کا ذکر کریں جس میں مصنف نے کچھ ایسے سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جو اصلاح طلب ہیں:

۱۔ 'ارمان جو رسومات کی نذر ہو گئے' یہ کہانی نہیں بلکہ ہمارے معاشرہ کی حقیقی تصویر ہے۔ ہماری ہر سماجی تقریب کو مذہبی رنگ دے کر رسومات اور روایات کی اندھی تقلید میں بے جا خرچ کرنا روزمرّہ کا عمل ہو گیا ہے۔ چنانچہ تعلیم یافتہ طبقہ کا فرض ہے کہ وہ شادی بیاہ، تکفین و تدفین وغیرہ جیسے ناگزیر مواقع پر بے بہا دولت کے بے جا تصرف سے گریز کریں۔

۲۔ "هٰذَا مِن فَضلِ رَبّی" میں شاہ جی کے کردار میں

اُن مسلمانوں کا پول کھول دیا گیا ہے جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور ہوتا ہے۔ اسلام کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر اُن کے اعمال سراسر غیر اسلامی ہوتے ہیں۔

۳- "سماج دشمن کون؟" ہر معاشرہ میں سماج دشمن عناصر موجود ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب نے نہایت ہی خوبی کے ساتھ کینیا کے ایشیائی باشندوں کی زندگی کی ایک جھلک دکھائی ہے جو ایک کرکٹ کے میدان سے شروع ہوئی اور سپر مارکیٹ کے پچھلے دروازہ پر ختم ہوئی۔

۴- "ڈھلتا سورج" میں لالہ جی کا کیریکٹر برٹش ایسٹ افریقہ کے بیشتر ایشیائی سرکاری ملازموں کی ذہنیت کا آئینہ دار ہے ــــــ

(آنریبل مسٹر جسٹس) عبدالرؤف سمناکے

نیروبی

۱۸ مئی، ۱۹۸۷ء

حرفِ چند

سرزمینِ کوکن نے صرف شاعر اور ادیب ہی پیدا نہیں کیے اردو کو چند اچھے افسانہ نگار بھی دیے ہیں۔

میرے مخلص کرم فرما شیخ اسماعیل صاحب بھی اردو کے ایک افسانہ نگار ہیں اور سرزمینِ کوکن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو کے ماحول سے کالے کوسوں دور کینیا کی راجدھانی کے شہر نیروبی میں انتہائی مصروف کاروباری زندگی گزارتے ہوئے بھی وہ اردو زبان و ادب کی بساط بھر خدمت کرتے رہتے ہیں۔ اردو سے ان کی یہ محبت اور لگاؤ واقعی قابلِ داد ہے۔ وہ برادرِ مکرم ساحر شیوی کے قریب ترین دوستوں میں سے ہیں اور کوکن اردو رائٹرس گلڈ کے ایک سرگرم و فعال عہدہ دار کی حیثیت سے

کام کر رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کا اوّلین مجموعہ گلڈ کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ میرے لیے ذاتی طور پر بے حد خوشی کی بات ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ اردو کے باذوق قارئین بھی میری اِس مسرت میں شریک ہوں گے۔

جہاں تک شیخ صاحب کے افسانوں کا تعلق ہے، یہ ابہام اور علامتوں کی بھرمار سے بالکل پاک و صاف ہیں اور بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ میں نے جب ان کا افسانہ "بدگمان" پڑھا تو مجھے بے ساختہ "شاعر" میں شائع شدہ جیتندر بلّو کا ایک افسانہ "بند دروازے" یاد آیا اور اس لیے یاد آیا کہ یہ دونوں افسانے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود دونوں کے انجام میں بہت کچھ مماثلت ہے۔ شیخ صاحب نے اپنے اِس افسانے کو جو عنوان دیا ہے وہ نہایت ہی موزوں ہے۔ اِس افسانے میں انھوں نے افریقیوں کے کردار کو نمایاں کرتے ہوئے بڑے مؤثر انداز میں بتایا ہے کہ افریقی غریب ضرور ہیں لیکن دھوکہ باز نہیں۔ ہندوستانی بظاہر اچھے سہی لیکن دھوکہ باز ہیں۔ شیخ صاحب کے جن افسانوں میں آفاقیت کی جھلک موجود ہے، ان میں میرے خیال سے یہ افسانہ سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے۔

شیخ صاحب کے ایک افسانے کا عنوان ہے: "ارمان جو رسومات کی نذر ہو گئے"۔ مجھے یہ افسانہ پریم چند کی روایت کی توسیع معلوم ہوتا ہے۔ اس افسانے کی زبان معیاری ہے اور رسم و رواج کی پابندیوں سے سماج کو جو نقصان پہنچ رہا ہے، اس کی وضاحت اس میں اچھی طرح نمایاں ہے۔ یہ افسانہ اپنی معراج کو اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں رحمت خاں دم توڑ دیتا ہے۔

یہاں پہنچ کر سوال اٹھتا ہے کہ آگے کیا ہوگا؟ اس کے بچے کی تعلیم کس طرح ہوگی؟ اس کی چھوڑی ہوئی رقم کا صحیح استعمال ہوگا یا نہیں؟ اور یہ معلوم کرنے کے لیے قاری افسانے کا باقی حصہ پڑھنے پر مجبور ہوتا ہے پھر جب رحمت خاں کی چھوڑی ہوئی دولت کے نقصان کو دیکھتا ہے تو خود بخود افسانہ نگار کا ہم نوا بن جاتا ہے۔

'خونِ ناحق' بھی میری نظر میں شیخ صاحب کا ایک اچھا افسانہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس افسانے کو پڑھ کر قاری کے دل میں مجاریہ سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ ایسا ہونا خلافِ واقعہ بھی نہیں۔ ہمارے یہاں اس قسم کے واقعات عام ہیں۔ اس افسانے میں سماج کو تنبیہ کی گئی ہے کہ گروہی ذہنیت بعض اوقات کیا کیا کرشمے دکھاتی ہے۔ شیخ صاحب نے اپنے افسانے 'پچھلا دروازہ' میں معاشرے کی جس خرابی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ خرابی بھی صرف افریقہ ہی میں نہیں، ہمارے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ اپنے بعض دوسرے افسانوں میں بھی شیخ صاحب نے سماج کی مختلف خرابیوں اور برائیوں کو کامیابی کے ساتھ نمایاں کیا ہے ——— شیخ صاحب نے اپنے بعض افسانوں کے عنوانات قائم کرنے میں بھی بڑی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے مثلاً 'ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا' غالب کے شعر کا بے حد مناسب اور برمحل استعمال اس افسانے میں ہوا ہے۔ اس افسانے کا کلائمکس بھی اچھا ہے اور اس میں سیٹھ امام الدین کے کردار کو بڑے خوبصورت انداز میں نمایاں کیا گیا ہے۔

شیخ صاحب کے افسانوں میں کہیں کہیں جو طنز ہے وہ بھی بڑا مزا دے جاتا ہے اور پھر خوبی یہ ہے کہ یہ طنز سطحی نہیں بلکہ اس میں تہہ داری ہے۔ اس اعتبار سے 'ھذا من فضلِ ربی' اور 'قصبہ شائستہ لوگوں کا' بطورِ خاص پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ 'ڈھلتا سورج' میں بھی شیخ صاحب نے طنز کا بھرپور وار کیا ہے۔ اس افسانے میں لالہ جی کا کردار بالکل حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ سماج میں نہ جانے ایسے کتنے کردار موجود

ہوں گے۔ اس افسانے کا آخری پارہ عبارت تقلیلِ الفاظ کی ایک اچھی مثال کی حیثیت سے بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

مختصر طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ افریقہ کے ماحول اور پس منظر میں لکھے گئے شیخ صاحب کے افسانے اپنے انداز کے بڑے شگفتہ اور دلچسپ افسانے ہیں جو واضح ہونے کے ساتھ ساتھ مقصدیت بھی لیے ہوئے ہیں۔ شیخ صاحب نے ان افسانوں میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہنے کی جو کوشش کی ہے، میری نظر میں یہی ان کے افسانوں کا سب سے بڑا اور سب سے اہم وصف ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے شیخ صاحب کے زیرِ نظر افسانے جو اس کتاب میں شامل ہیں، 'نقشِ کوکن' میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہیں۔ کسی ایک ہی رسالے سے جذباتی لگاؤ رکھنا اور اپنی تمام تحریریں کسی ایک ہی رسالے میں چھپوانا معتوب تو نہیں، —— پھر بھی اگر شیخ صاحب ذرا سی توجہ دیتے اور اپنے یہ افسانے کچھ دوسرے رسائل میں بھی چھپوا لیتے تو عجب نہیں تھا کہ وہ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی اِدھر اُدھر مشہور ہو جاتے۔ بہر طور افسانوں کے اس مجموعے کی اشاعت پر میں شیخ صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ کتاب ان کی مقبولیت کا وسیلہ بن جائے۔

—— بدیع الزماں خاور

داپولی ضلع رتناگیری

(مہاراشٹر)

۷ر فروری ۱۹۸۷ء

بدگمان

فلیٹ کئی دنوں سے خالی پڑا تھا۔

دو فلیٹس پر مشتمل جس دوکان میں ہم میاں بیوی سکونت پذیر ہیں وہ میری بیگم کی ذاتی ملکیت ہے جسے ان کے مرحوم باپ نے ہماری شادی کے موقع پر بطور تحفہ عنایت کیا تھا —— ایک فلیٹ میں ہم رہتے ہیں، دوسرا بیگم کے لیے مستقل

آمدنی کا ذریعہ ہے۔ ایسے دَور میں جب کہ نیروبی میں جائے باش کی سخت دُشواری ہو کسی فلیٹ کا خالی رہنا مضحکہ خیز بات ضرور تھی۔ مگر بیگم کی کسوٹی پر اُترنا بھی تو کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ انھیں کوئی معقول کرایہ دار ہی نہیں مل رہا تھا۔

کئی دنوں سے مسٹر مطریشی نامی میرا ایک کولیگ مکان کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ غریب پر مجھے رہ رہ کر ترس آتا تھا، مگر میں بے بس تھا —— بیگم کے معاملات میں دخل دینے کا مجھے ذرہ برابر حق حاصل نہیں تھا۔ پھر بھی ایک روز انھیں کچھ اچھے موڈ میں دیکھ کر میں نے ہمت کر ہی لی اور فلیٹ مسٹر مطریشی کو کرایہ پر دینے کی عاجزانہ التماس کی۔

" تمھاری مت تو نہیں ماری گئی ہے۔ تمھیں یہ کیوں کر خیال ہُوا کہ میں اپنا فلیٹ کسی افریقی کو کرایہ پر دوں گی؟" —— بیگم نے مجھے ڈانٹنے کے لہجے میں کہا۔

" مگر اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

" تم سدا کے بدھو ہو۔ تم ان کالوں کو نہیں جانتے۔ میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ نہ وقت پر کرایہ دیتے ہیں، نہ گھر کو حفاظت سے رکھتے ہیں۔ مگر تمھیں کھرے کھوٹے کی پرکھ کہاں؟"

" کالے گورے سب اللہ ہی کی تو مخلوق ہیں۔ افریقیوں میں بھی تو درجنوں دیانت دار اور سلیقہ شعار پائے جاتے ہیں، ان کی ایمانداری کی میں کئی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔"

" بس کرو اپنا لیکچر —— بڑی ہمدردی ہے تمھیں ان وحشیوں سے۔

اگر ایسی ہی بات تھی تو کسی حبشن سے شادی کر لیتے، گھر کی مالکن مَیں ہوں اور مَیں اپنی پسند کا کرایہ دار لاؤں گی" ——

نہ جانے بیگم کو افریقیوں سے اس قدر نفرت کیوں تھی۔ حالانکہ نہ صرف ان کی بلکہ ان کے والدین کی بھی پیدائش کینیا ہی میں ہوئی تھی۔ بیگم نے یہیں پر پرورش پائی اور ادھر ہی کی ہو کر رہیں۔ انھیں تو یہاں کے لوگوں سے مجھ سے بھی زیادہ مانوس ہو جانا چاہیئے تھا۔ دراصل ان ہی کی بدولت آج میں افریقہ میں ہوں۔ نہ ان سے شادی ہوتی نہ مجھے افریقہ نصیب ہوتا۔

اُن دِنوں جو مجھ جیسے حرماں نصیب ہندوستانی یہاں کی لڑکیوں کے عقد میں بندھ کر سمندر کے اس پار آجاتے تھے عام طور پر 'ڈیوک' کہلاتے تھے۔ غالباً یہ نام انگلستان کی ملکہ الیزبتھ کے خاوند ڈیوک آف ایڈنبرا سے منسوب تھا۔ بڑی امنگیں لے کر اپنے عزیز واقارب سے بچھڑ کر یہاں آجاتے مگر اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی زن مُرید اور زر خرید غلام بن کر رہ جاتے۔

ایک شام دفتر سے گھر لوٹا تو خالی فلیٹ میں کچھ چہل پہل دکھائی دی۔ نئے کرایہ دار سے مجھے متعارف کرانا بیگم کے شایانِ شان نہیں تھا۔ چنانچہ بیگم سے آنکھ بچا کر مَیں نے خود ہی یہ فرض انجام دیا۔ کرایہ دار ونود بابو ایک انشورنس فرم میں ایجنٹ تھے۔ ان کی پتنی ارچنا کسی نرسری اسکول میں پڑھایا کرتی تھیں، مگر ورک پرمٹ کی میعاد ختم ہو جانے کی وجہ سے ان دنوں بے کار تھیں۔ ان کے دو بچے تھے اور دونوں انگلینڈ منتقل ہو چکے تھے۔

چند ہی دنوں میں بیگم اور ارچنا کچھ ایسی گھُل مل گئیں جیسے بچپن کی سہیلیاں ہوں البتہ میرے اور ونود بابو کے بیچ فاصلے پیدا کرنے کے لیئے وہ ہر وقت کوشاں رہتیں۔ شروع شروع

میں فرصت کے اوقات میں ونود بابو کے ساتھ ایک آدھ شطرنج کی بازی ہو جایا کرتی۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ میں بیگم کی کج مزاجی اور سرزوری نے میرے اس محبوب مشغلہ سے بھی مجھے محروم کر دیا ——— شاید عورت کی فطرت کا یہی تقاضہ تھا ——— سچ تو یہ ہے کہ مجھے ہر قسم کی اذیت پہنچا کر بیگم ایک عجیب سی لذت اور مسرت محسوس کرتی ہیں۔ جیسے بلی ایک آدھ موے چوہے سے کھیلتے ہوئے کرتی ہے۔

ہر روز بلا ناغہ، بیگم کی آنکھ کھلنے سے پہلے بیڈ ٹی بنا کر ان کے سرہانے رکھ کر چھوڑنا میرے صبح کے فرائض میں شامل ہے ——— چونکہ آج تک قدرت نے ہمیں اولاد کی نعمت سے سرفراز نہیں کیا اس لیے گھر میں ہم نے ایک بلی پال رکھی ہے جسے ہم ٹیمی کہتے ہیں۔ ایک دن میری جو شامت آئی، ٹیمی نے چائے کی پیالی سرہانے رکھے ہوئے اسٹول سے گرا دی۔ بیگم آنکھوں سے شعلے اور زبان سے گالی گلوچ برساتی ہوئی جاگ اٹھیں اور آناً فاناً گویا سارا گھر شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ بے چاری ٹیمی بھی دبک کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔

عام طور پر گھر میں جب کبھی ایسا ہنگامہ ہوتا پڑوس سے ارچنا دوڑتی ہوئی آتیں اور جلتی پر تیل ڈالتی رہتیں۔ مگر اس روز ارچنا نہیں آئیں اور آگ جلد ہی بجھ گئی۔ ارچنا کی عدم مداخلت نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ بیگم کی تو خیر بات ہی اور تھی۔ چنانچہ وہ بذاتِ خود اپنی چہیتی پڑوسن کے ہاں خیر و عافیت دریافت کرنے گئیں۔ لیکن روتی چلاتی الٹے پاؤں پھر گئیں۔ "ہائے میں لٹ گئی۔ . . ہائے میں مر گئی۔ موئے آٹھ مہینوں کا کرایہ دیے بغیر راتوں رات گھر خالی کر کے بھاگ گئے۔ . . ہائے میں لٹ گئی۔"

بیگم کے ہاتھ میں کھلا ہوا ایک لفافہ تھا۔ جس میں خالی فلیٹ کی چابیوں کا گچھا تھا اور لفافے کے اوپر لکھا تھا:

"ہمیں ڈھونڈنے کی فضول کوشش مت کرنا کیونکہ جس وقت فلیٹ کی یہ چابیاں تمھارے ہاتھ میں ہوں گی ہم رات کی فلائٹ سے یہ مُلک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر انگلینڈ جا چکے ہوں گے —— ارچنا"

فلیٹ آج بھی خالی پڑا ہے۔

○○
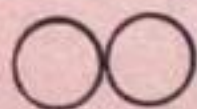
ارمان جو رسومات کی نذر ہو گئے

رحمت خان میرے اچھے دوستوں میں سے ایک تھے۔ شاید ہی
کوئی ایسا دن گزرتا جب میں ان کے ہاں نہ جاتا —— اور کسی روز ناغہ ہوا
بھی تو بذاتِ خود عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر اپنی سائیکل پر سوار ہو کر میرے
ہاں آجاتے۔

ریلوے کے ملازم ہونے کی حیثیت سے رحمت خان نیروبی کے ریلوے

کوارٹرز میں رہا کرتے تھے۔ وہ چالیس کے پیٹے میں تھے —— بھابی ذکیہ —— کہ ان کی بیگم کا یہی نام تھا، اس وقت انتقال کر گئی تھیں۔ جب ان کا اکلوتا بیٹا شبیر صرف سات سال کا تھا۔ اگر چاہتے تو رحمت خان دوسری شادی کر سکتے تھے، مگر انھوں نے شبیر کے بہتر مستقبل کو شادی پر ترجیح دی اور کارزارِ حیات میں دلیرانہ کود پڑے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے لڑتے رہے اور اس امید پر جیتے رہے کہ اپنے لختِ جگر کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دے کر اپنی بیوی کی اس وصیت کو پورا کریں گے جو مرحومہ نے مرتے وقت کی تھی۔ شبیر ایک انتہائی ہونہار بچہ تھا —— اس کی ماں کی یہ دلی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا خوب پڑھے لکھے اور معاشرہ کا ایک ایسا فرد بن جائے جس پر انسانیت ناز کر سکے۔

شبیر کی ماں تو خیر اپنے ارمانوں کو سینے میں دبائے رخصت ہوئی مگر باپ نے پوری تندہی سے اسے پالا پوسا۔ سولہ سال کی عمر میں شبیر ایسٹ افریقن سرٹیفکیٹ آف ایجوکیشن کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کر چکا تھا اور آگے مزید پڑھنے کا اس کا مصمم ارادہ تھا۔

ایک شام حسبِ معمول میں رحمت خان کے گھر گیا تو باپ بیٹا آپس میں شبیر کی اعلیٰ تعلیم سے متعلق صلاح مشورے کر رہے تھے۔ کچھ دیر بیٹھ کر جب میں اٹھنے لگا تو رحمت خان مجھ سے مخاطب ہوئے:

"میرے بھائی! ایک بات سن کر چلے جاؤ۔ تم جانتے ہی ہو کہ بنک میں پیسے رکھنے کے میں شروع ہی سے خلاف ہوں۔ چنانچہ شبیر کی یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے جو پونجی میں نے بچا رکھی ہے وہ اس الماری میں (الماری کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے) رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی ہری تجوری میں محفوظ ہے۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے ؟ اچھا خدا حافظ" ——

جس محنت اور جفاکشی سے رحمت خان اپنے بیٹے کو تعلیم و تربیت دے رہے تھے اُس پر کوئی بھی رشک کر سکتا تھا۔ بیٹے کے مستقبل کو درخشندہ بنانے میں وہ ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ اُن کی ساری کائنات شبیر کے ارد گرد گھومتی تھی یوں لگتا تھا جیسے انھوں نے اپنی تمام تر زندگی اسی کے لیے وقف کر دی تھی۔

اور پھر ایک دن . . . ایک تیز رفتار 'مٹاڈو' سائیکل سوار رحمت خان کو کچلتی گزر گئی۔ زخمی کو ہسپتال لے جایا گیا لیکن وہ راستے ہی میں دم توڑ گیا۔

اس حادثۂ جانکاہ کی خبر مجھے ملتے ہی میں مرحوم کے کوارٹر گیا۔ ابھی تک متوفی کی لاش 'سٹی مورچری' میں ہی تھی۔ شبیر کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ چند لوگ جو بظاہر شبیر کے غم گسار لگتے تھے بار بار شبیر کو سینے سے لگا کر اسے تسلی و تشفی دے رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی شبیر کے منہ سے دردناک چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو گیا —— فوراً ڈاکٹر کو بلانے کی میری تجویز برادری والوں اور رشتے داروں نے مسترد کر دی اور میں محض ایک تماشائی بن کر رہ گیا —— بھلا ان کے گھریلو معاملات میں دخل دینے والا میں کون ہوتا تھا ؟

ماتم کرنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ تھوڑی دیر بعد لاش بھی آ گئی۔ پھر شبیر کی بے ہوشی کی حالت میں اور میری نظروں کے سامنے برادری والوں نے ہری تجوری کھول دی جو الماری میں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے بہتیرا منع کیا۔ سمجھایا بجھایا، مگر میری کسی نے نہ سُنی —— جلد ہی تکفین و تدفین کا انتظام کیا گیا اور اس طرح پلک جھپکتے ہی رحمت خان غریقِ رحمت ہو گئے۔

چونکہ مرحوم کے گھر میرا بار بار جانا بے جا مداخلت پر محمول کیا جاسکتا تھا، اس لیے مَیں نے کئی دنوں سے شبیّر کی خیریت تک حاصل نہ کی تھی۔

آخر ایک دن شام کے وقت (اتفاقاً وہ جمعرات کی شام تھی) مَیں مرحوم کے گھر گیا مگر کیا دیکھتا ہوں کہ کوارٹر کو تالا لگا ہوا ہے۔ پڑوسیوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ رحمت خان کی وفات کے کوئی ایک ہفتہ بعد شبیّر ریلوے کوارٹر خالی کر کے اپنے چچا کے ہاں رہنے کے لیے چلا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے مرحوم کے بھائی دولت خان کے دولت کدے کا رخ کیا ——— مَیں نے دُور سے دیکھا کہ ان کا گھر بجلی کے قمقموں سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا ——— ذرا قریب گیا تو دیکھا کہ گھر کے سامنے بیسیوں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ گھر کے اندر مرد، عورتوں اور بچّوں نے ایک کہرام بپا کر رکھا تھا۔

"یہ دیگ تیار ہو گئی ہے ——— جاؤ یہ جگ پانی سے بھر ڈالو ——— دیکھو سب پلیٹیں میز پر رکھ دو ——— اور ہاں یہ طشتری مولوی صاحب کے لیے ہے ——— انھیں یہ ضرور بتانا کہ آج کُل تین ختم ہو گئے ہیں۔ (ختم قرآن) ——— اکرم! تم شبیّر کا خیال رکھو ——— وہ اپنے کمرے سے باہر نہ آنے پائے۔"

اس قسم کی بلند آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ یہ لوگ مرحوم رحمت خان کی برادری اور رشتے داروں میں سے تھے۔ دور دراز سے کاروں میں آنے والوں اور دیگر پیشہ ور چہلم خوروں کی آمد کا ابھی تک انتظار تھا۔

میرے قدم وہیں رک گئے، اور وہاں کھڑا میں سوچتا رہا کہ آج تو تیسری جمعرات ہے، ابھی ایک اور جمعرات اور جہلم باقی ہے۔

'مٹاٹو'[1] نے تو شبیر کے باپ کو کچلا تھا مگر اس کے مستقبل اور اس کے والدین کے ارمانوں کو برادری والے اور ان کے رسم و رواج کس بیدردی سے مسل رہے ہیں؟ ———

○○

---

[1] سواحلی زبان میں 'مٹاٹو' ایک قسم کی پبلک سروس وہیکل کو کہتے ہیں۔

○

خونِ ناحق

نیروبی ایکسرے سینٹر میں مَیں نے اپنا ایکسرے کھنچوایا، اور چند ہی گز کے فاصلے پر کامن ویلتھ ہاؤس کی پانچویں منزل پر واقع لیبارٹری سروس میں بلڈ ٹیسٹ کروانے گیا ——

دفتر سے نکلتے وقت مَیں اپنے ساتھ مچاریہ نام کا چپراسی لے کر گیا تھا تاکہ

رپورٹ تیار ہونے پر اُسے لیباریٹری سروس میں لے آئے ہیں ایک دو اور بھی کام تھے —— جواں سال مچاریہ بن کریو کی بے حد محنتی اور فرماں بردار ملازم تھا جو جونیر سیکنڈری تک تعلیم پائی تھی، اور اس اعتبار سے اُسے دفتر کے دوسرے چپراسیوں پر برتری حاصل تھی۔ اب چونکہ وہ برسرِ روزگار تھا اس لیے والدین کی دیرینہ تمنّا کی تکمیل میں اس کا بیاہ رچایا جانے والا تھا۔

مَیں وٹینگ روم میں بیٹھا بلڈ ٹیسٹ کی رپورٹ اور مچاریہ کی آمد کا منتظر تھا کہ اچانک ایک شور سا سُنائی دیا —— "پکڑو . . . مارو . . . چور . . . پکڑو . . . چور . . . مارو . . ." کی صدائیں فضا کو چیرتی ہوئی میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں —— کھڑکی سے جھانک کر جو دیکھا تو نیچے سڑک پر لوگوں کا ایک ہجوم کسی کا تعاقب کرتا ہوا نظر آیا —— دیکھتے ہی دیکھتے مشکوک زمیں گیر ہو گیا تھا۔ اس پر کوئی پتھر برسا رہا تھا تو کوئی لات رسید کر رہا تھا، کوئی گھونسے جما رہا تھا تو کوئی تھوک رہا تھا —— اس درمیان میں چونکہ میری بلڈ رپورٹ تیار ہو چکی تھی، اس لیے مجھے کیشیئر کی طرف رجوع ہونا پڑا۔ اس سے فراغت پانے تک نیچے سڑک پر شور وغل کافی کم ہو چکا تھا اور جائے واردات پر پولیس کی ایک گاڑی —— ایک ایمبولنس کار اور چند لوگ دکھائی دے رہے تھے، مَیں بدستور وٹینگ روم میں بیٹھا مچاریہ کا انتظار کرنے لگا . . .

دوسرے ممالک کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا، البتہ ہمارے اپنے ملک یعنی کینیا میں اس قسم کی واردات آئے دن ہوتی رہتی ہے —— کسی نے

جیب کاٹ لی تو کوئی ایئر رنگ کھینچ لے گیا ——— کسی نے رسٹ واچ چھین لی تو کسی نے ہینڈ بیگ یا پرس اُڑا لیا ——— بہت ہی گھٹیا قسم کی چوریاں ہوتی ہیں، کئی تو رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں اور بہتوں کی شک کی بنا پر پٹائی ہوتی ہے، عام طور پر جس کسی پر اس قسم کے جرم کے ارتکاب کا شک ہوتا ہے اس پر پبلک ٹوٹ پڑتی ہے ——— قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے کر لوگ مشتبہہ کو اَدھ مُوا کر دیتے ہیں، بلکہ بعض اوقات تو جان سے بھی مار ڈالنے میں دریغ نہیں کرتے ——— جدید اصطلاح میں اسے ماب جسٹس (انصاف خلق) یا انسٹنٹ جسٹس (فوری انصاف) کہتے ہیں۔

مجھے ویٹنگ روم میں بیٹھے گھنٹہ سوا گھنٹہ ہو چکا تھا، اور ابھی تک مجاریہ کا کچھ پتہ نہیں تھا ——— میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی ——— نیروبی ایکسرے سینٹر کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ لگ بھگ پونہ گھنٹہ پہلے کوئی شخص ایکسرے فلم اور رپورٹ لے جا چکا تھا ——— 'مجاریہ یہاں آنے کے بجائے کہیں آفس نہ چلا گیا ہو' ——— میں نے سوچا، مگر اس کے امکانات بہت کم تھے، کیونکہ طے یہ پایا تھا کہ ایکسرے اور بلڈ ٹیسٹ کے چکر سے فارغ ہو کر ہم پرنٹرز کے یہاں جائیں گے، جہاں اس نے شادی کے کارڈ چھپوانے کے لیے دینے تھے۔ اپنی تسلی کے لیے میں نے دفتر اور اس کے بعد پرنٹرز کے ہاں فون کیا، مگر مجاریہ کا کہیں ٹھکانہ نہیں تھا ——— چار و ناچار میں اپنی بلڈ رپورٹ لے کر گھر چلا آیا۔

اگلے روز اخبار "ڈیلی نیشن" کے تیسرے صفحے پر چھپی ہوئی ایک تصویر پر

نظر پڑی تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ——— تصویر میں بُری طرح پیٹی ہوئی مچاریہ کی لاش دکھائی گئی تھی اور پاس ہی ایک بڑا سا لفافہ پڑا ہوا تھا جس میں یقیناً میرے ایکسرے فلم و رپورٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا:

" اصل مجرم تو بینک کے کیشیئر کو لوٹ کر ایک چوری شدہ کار میں فرار ہو گیا، اور عوام نے اس بے گناہ کو محض شک کی بِنا پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جیب سے نکلے ہوئے شناختی کارڈ کے مطابق مقتول کا نام مچاریہ بن کریو کی تھا۔"

میری آنکھوں سے اُمنڈتا ہوا آنسوؤں کا سیلاب میں روک نہ سکا۔

○○
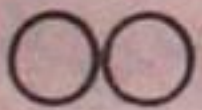
پچھلا دروازہ

اُس اتوار کو نیروبی کے وانڈررس کرکٹ کلب WANDERERS C.C.
پر تماشائیوں کی کچھ زیادہ ہی بھیڑ تھی ـــــــ اس غیر معمولی بھیڑ کی وجہ یہ تھی کہ
جن دو ٹیموں کے درمیان میچ کھیلا جانے والا تھا وہ ٹیمیں لیگ ٹیبل میں بالترتیب
دوسری اور تیسری پوزیشن میں تھیں۔ اور اخبار کی رپورٹس کے مطابق نہایت ہی
زوردار مقابلے کی توقع کی جاتی تھی ـــــــ البتہ یہ بات الگ ہے کہ کھیل

کے اختتام پر میچ بالکل ہی یک طرفہ ثابت ہُوا تھا ۔ حسبِ معمول کھلاڑیوں اور دیکھنے والوں کی اکثریت ایشیائیوں کی تھی ۔

جس وقت مَیں اپنے ایک دوست کے ساتھ گراؤنڈ پر پہنچا اس وقت لوگ اپنے علیحدہ علیحدہ گروپ بنا چکے تھے ——— میرے دوست نے ایک درخت کے سایہ تلے اپنی کار پارک کی اور ہم دونوں نے اُدھر کا رُخ کیا، جدھر ہماری ٹولی ایک طرف گھاس پر بیٹھی ہماری آمد کی بے تابی سے منتظر تھی :

" لیجیے دو اور پچھے آگئے " ——— ساتھ والے گروپ میں کھڑے بھگوان داس نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے طنز کیا ۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان میچوں میں لوگ کھیل دیکھنے کم جایا کرتے ہیں اور تفریحِ طبع اور چھیڑ چھاڑ کے لیے زیادہ ——— الگ الگ گروہ میں بٹے ہوئے تماشائیوں میں ایک آدھ درجن پر مشتمل ایک گروہ ایسا بھی ہوتا ہے جو کسی ایک جگہ ٹِک کر بیٹھ نہیں پاتا ۔ کہیں کھڑے ہو کر دو چار اوورس OVERS دیکھ لیے، کچھ تبصرہ کیا، کچھ سُنی، کچھ سُنائی اور آگے بڑھ گئے ۔ یہ گروہ " چلتا پھرتا گروپ کے نام سے مشہور ہے اور اس کی قیادت ظفر اللہ نامی ایک اُدھیڑ عمر حضرت کیا کرتے ہیں ——— ظفر اللہ خواہ کھڑے ہو کر کھیل دیکھ رہے ہوں یا چل پھر رہے ہوں، ایک لمحہ کے لیے خاموش نہیں رہ سکتے ۔ ان کی باتوں کے موضوعات کھیل کود کے علاوہ مذہب، سیاست، اَدب، ثقافت، نفسیات، اخلاقیات، معاشیات وغیرہ ہوا کرتے ہیں ۔

اب کھیل شروع ہو چکا تھا ۔ جس ٹیم کی حمایت ہمارا گروہ کر رہا تھا اس کے

دونوں اوّلین کھلاڑی (OPENING BATSMAN) بلّا بازی کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے ایک سو رنز (RUNS) بنا چکے تھے —— بھگوان داس کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔

"کیوں جی بھگوان داس چپ کیوں ہو؟ —— سو رنز بننے پر اگر تالیاں نہیں بجا سکتے نہ بجاؤ کم از کم اپنے ہونٹوں کا پھاٹک تو کھول دو" —— سامنے والے کیمپ سے حق نواز نے بھگوان داس کو للکارا۔

بھگوان داس بدستور خاموش رہا —— اور عین اس وقت بائیں جانب سے ظفراللہ کی سرکردگی میں چلتا پھرتا گروپ ہمارے کیمپ کے قریب آ رکا۔ ظفراللہ نے اپنی گرجدار آواز میں لیگ امپائر (LEG EMPIRE) کو دھمکی دی کہ ذرا سی غلطی پر اُس کی وہ درگت بنائی جائے گی جو کئی سال پہلے ایم ہی، سی نے پاکستانی امپائر ادریس بیگ کی بنائی تھی —— پڑوس میں رہنے والے ایک عمر رسیدہ مولوی کے تیسری شادی کرنے پر اُس کی مٹی پلید کی، سابق شہنشاہِ ایران کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور پھر وہ اپنے ساتھیوں سمیت آگے کو ہو لیے۔

اس درمیان میں دو وکٹس (WICKETS) گر چکی تھیں —— بھگوان داس گلا صاف کر رہے تھے۔

"پہلوان! پہلے ہی بال پر چھکا مار کر اس بھگوان کے داس کا گلا اگر بالکل ہی صاف کر دو تو مزہ ہی آ ئے" —— حق نواز نے آنے والے نئے بلّے باز کی آڑ میں بھگوان داس پر ایک اور وار کیا۔

جب پہلے بال پر کوئی رن نہیں بنا تو فضا میں ایک زوردار آواز گونجی:

"اس غریب نے کیا چھکّا مارنا ہے جب کہ اس کے اپنے چھکّے چھوٹے ہوئے ہیں۔ اُسے کہہ دو کہ خالص مکھّن کھایا کرے" ——

"تمھارے مُنہ سے یہ بات سجتی نہیں بھگوان داس —— کچھ تو شرم کرو کمینے" —— حق نواز غرّایا —— "تم جیسے سماج دشمن تاجروں نے دُنیا بھر کا مال سمیٹ کر اپنے گودام سجا لیے ہیں اور ملک میں صرف مکھّن ہی کیا بلکہ ہر ضروری شئے کی خود ساختہ قلّت پیدا کر رکھی ہے تاکہ کالا بازار گرم رہے۔ بھگوان داس! منہ کھولنے سے پہلے ذرا اپنے گریبان میں جھانک تو لیا ہوتا۔"

کھیل بدستور جاری رہا ——

دوسرے اتوار کو جب مچھلی مارکیٹ جانے کے لیے میں گھر سے نکلا تو یاددہانی کے طور پر میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ دودھ اور مکھّن کے پیکیٹس اگر کہیں سے ہاتھ آجائیں تو ضرور لیتا آؤں —— راستہ بھر مَیں اپنے بیوی بچّوں کی بے بسی پر افسوس کرتا رہا۔ کئی دنوں سے بچّوں نے دودھ نہیں پیا تھا، مکھّن اور گھی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ گھر میں چاول تو کئی مہینے ہوئے نہیں پکے تھے —— غرض کہ روزمرّہ استعمال میں آنے والی ضروری اشیاء کچھ ایسی نایاب تھیں کہ جینا محال ہو گیا تھا۔ دفعتاً مجھے حق نواز کی وہ کھری کھری باتیں یاد آئیں جو انھوں نے پچھلے اتوار بھگوان داس کو سُنائی تھیں —— کتنی صداقت تھی ان کی باتوں میں۔ کاش کہ حق نواز جیسے حق گو ہمارے سماج میں چند اور بھی ہوتے! ہمارے معاشرہ میں جو خرابیاں ہیں وہ بھگوان داس جیسے لوگوں ہی کی تو پیدا کردہ ہیں۔

مچھلی مارکیٹ میں ابھی تک تازہ مچھلی نہیں آئی تھی، اس لیے تازہ ہوا کھانے کے لیے

مَیں مارکیٹ سے باہر نکلا ——— سامنے ایک سوپر مارکیٹ کی طرف جب میری نظر گئی تو دیکھا کہ لوگ قطار باندھے کھڑے ہیں ۔ جگہ جگہ قطار کا بندھنا آج کل معمول سا ہو گیا ہے ۔ ظاہر تھا کہ آٹا ، دودھ ، مکھن یا کوئی ایسی ہی کمیاب چیز بِک رہی ہوگی ۔ مَیں بھی جھٹ سے قطار میں شامل ہو گیا ۔

قطار کافی لمبی تھی اور ہر لمحہ اور بھی لمبی ہوتی جا رہی تھی ۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ نہ مَیں جانتا تھا کہ کون سی چیز بِک رہی ہے جسے خریدنے کے لیے ہم کھڑے تھے اور نہ ہی میرے ہم قطار میں سے کسی کو علم تھا ۔ لائن میں کھڑے لوگوں کی اکثریت افریقیوں کی تھی ——— کئی ایشیائی بھائی و بہنیں تھیں اور تین یا چار انگریز جوڑے بھی تھے ۔

" دیکھا یہ جنگلی کیسا لائن میں گھس گیا ——— انڈی پن ڈنس INDEPENDENCE کو ملے سولہ سال ہو گیا مگر اس آفریکن کو کبھی آکل نہیں آئے گا " ——— میرے پیچھے کھڑا لگ بھگ میری ہی عمر کا ایک آدمی چِلّایا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ گووَن (GOAN) چرچ سے نکل کر میری ہی طرح مچھلی مارکیٹ جا رہا تھا کہ لائن دیکھ کر میرے دو تین قدم پیچھے کھڑا ہو گیا تھا ۔

" برادر ! دراصل یہ آدمی میرے آنے سے پہلے ہی لائن میں کھڑا تھا ۔ پاس والے کی اجازت سے اخبار خریدنے گیا ہوا تھا " ——— مَیں نے اپنے گووَن بھائی کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا ۔

خدا خدا کر کے سوپر مارکیٹ کا دروازہ کھُلا ۔ ایک وقت ایک ہی آدمی کو دوکان

کے اندر داخلہ ملتا اور اُسے مارکیٹ کے پیچھے دروازہ سے باہر کر دیا جاتا —— چونکہ یہ پچھلا دروازہ دوسری سڑک پر نکلتا تھا اس لیے ہم قطار میں کھڑے باہر نکلنے والے گاہکوں کو دیکھ نہیں سکتے تھے —— البتہ جو اکا دکا مڑکر واپس آجاتا تو اس کے ہاتھ میں مکھن کا ایک پیکیٹ ضرور نظر آتا۔

میرے آگے ابھی تک کوئی بیس پچیس لوگ قطار میں کھڑے تھے اور پیچھے ایک جم غفیر —— یکایک کسی نے اپنی کار کے بریک لگائے اور گاڑی کو موڑ کر اس سڑک کی طرف ہو لیا جدھر سے سوپر مارکیٹ کا پچھلا دروازہ کھلتا تھا —— کار حق نواز کی تھی اور وہی چلا رہے تھے۔ میں نے سوچا شاید انھیں کرکٹ جانے کی عجلت ہوگی۔ اگر چند سیکنڈ کے لیے کھڑے رہتے تو ان کے ذریعے میں اپنے دوستوں کو کہلوا دیتا کہ میرا انتظار کریں۔ یہاں سے فارغ ہوتے ہی گراؤنڈ پر آجاتا ہوں —— اب تو تازہ مچھلی آکر ختم بھی ہو گئی ہوگی، میں نے مزید سوچا۔

انھیں خیالات میں مستغرق میں دُکان کے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ ”مکھن ختم ہو گیا“ کہہ کر دوکان کے نوکر نے جھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔ قطار میں کھڑے لوگ مایوس ہو کر منتشر ہو گئے۔

چند قدم چلنے پر مجھے اسی سڑک پر حق نواز کی پیلے رنگ کی ڈاٹسن کار کھڑی دکھائی دی جس طرف وہ مُڑی تھی۔ میں ان کی کار کے پاس پہنچا ہی تھا کہ حق نواز سوپر مارکیٹ کے پچھلے دروازہ سے باہر نکلے —— ان کے پیچھے پیچھے دوکان کا ایک نوکر تھا جس کے ہاتھ میں پچاس پیکیٹ والا مکھن کا ایک کارٹن (صندوق) تھا۔ حق نواز یہ کارٹن اپنی کار کے بوٹ میں رکھوا رہے تھے کہ ہماری نظریں چار ہوئیں۔

”حضرت! آپ؟ ۔۔۔ ا ۔۔۔ و ۔۔۔ یہاں؟ اور ۔۔۔ اس وقت؟“

حق نواز کچھ بوکھلا سے گئے تھے۔

"بھئی سوپر مارکیٹ میں مکھن بک رہا تھا۔ مگر اپنی پھوٹی قسمت میں مکھن کہاں۔ میری باری باری آتے آتے سب ختم ہوگیا" ——— میں نے جواب دیا ——— "پھوٹے قسمت دشمنوں کی" حق نواز نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "کیا آپ نہیں جانتے کہ اس سوپر مارکیٹ کا وہی مالک بھگوان داس ہے جس کے ساتھ کرکٹ گراؤنڈ پر ہماری نوک جھونک ہوا کرتی ہے ——— ذرا ہمت کر کے اس پچھلے دروازے سے ان سے مل لیجیے۔ ایک پیکٹ کیا میری طرح آپ بھی پورا کارٹن لے کر باہر نکلیں گے ——— ہاں یہ ضرور ہے کہ قیمت کنٹرول بھاؤ سے دگنی ادا کرنی پڑے گی۔"

اُس روز میں خالی ہاتھ گھر لوٹا ——— اور میچ دیکھنے بھی نہیں گیا۔

○○

ہائے اُس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا

سَر مارئیکل کرِپس میموریل لائبریری ہال، نیروبی میں، کوئی بیس پچیس افراد مختلف
میزوں پر اخبار و رسائل پڑھنے میں منہمک تھے۔ بجُز ایک طالب العلم کے جو اپنے دونوں ہاتھوں
اور سر کو میز پر رکھ کر باقاعدہ سو رہا تھا۔
اسکول یونیفارم میں ملبوس اس تیرہ چودہ سالہ بچے کے خراٹوں کے پس منظ
میں دفعتاً کسی نے دروازے کے قریب رکھی ہوئی ڈیسک پر تھاپ دی اور ایک لمحے کے

لیے مجھے یوں لگا جیسے کوئی قوالی کا پروگرام ترتیب دیا جا رہا ہو۔ پڑھنے والوں کی نظریں اخبار ورسائل سے ہٹ کر اس خوبرو نوجوان پر مرکوز ہو گئیں، جو ڈیسک کے پاس کھڑا کچھ کہنا چاہتا تھا:

"خواتین و حضرات!" نوجوان مخاطب ہوا ——— "مَیں اس خلل اندازی کے لیے صدق دل سے معذرت چاہتا ہوں۔ اگر آپ اپنے قیمتی وقت سے چند منٹ میری دو باتیں سننے میں صرف کر دیں تو مَیں آپ کا بیحد ممنون ہوں گا۔" مغربی وضع قطع کے اس نوجوان نے نہایت شستہ انگریزی میں لوگوں سے اپیل کی:

"سب سے پہلے میں اپنے آپ کو متعارف کراؤں ——— میں سیٹھ امام الدین کا پوتا اور مرحوم بہر دین کا بیٹا چراغ دین ہوں۔ دوست احباب مسٹر ڈین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ سات سال یورپ اور امریکہ میں رہ کر اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے حال ہی میں اپنے وطن کینیا واپس لوٹا ہوں۔"

"خوش آمدید مسٹر ڈین" کسی نے چلّا کر بوریت کا اظہار کیا۔

"جانتا ہوں کہ مَیں آپ کی سمع خراشی کا باعث بن رہا ہوں۔ مگر میری گزارش ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے آپ تحمل سے کام لیں، اور مجھے کچھ کہنے کا موقع دیں۔ مَیں آپ کی خدمت میں بلڈ بینک (BLOOD BANK) سے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے اس ملک میں آئے دن بیسیوں جانیں اس لیے ہلاک ہوتی ہیں کہ ضرورت منداشخاص کو بروقت خون بہم پہنچانے کا کوئی خاطر خواہ بندوبست نہیں ہے ——— چنانچہ ایک ایسی تنظیم کا قیام بہت ضروری ہے جسے ترقی یافتہ ملکوں میں بلڈ بینک کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ فراخدل

افراد اپنے خون کا کچھ حصہ بلڈ بینک کو وقتاً فوقتاً دیتے رہتے ہیں۔ اور بینک جمع شدہ خون کے ذخیرے کو مختلف گروپوں میں محفوظ کر کے ہر ضرورت مند شخص تک پہنچانے کا اہتمام کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میری اس تجویز کو بروئے کار لانے کے لیے کچھ فنڈز درکار ہوں گے . . "

"خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے" —— کسی نے بات کاٹتے ہوئے طعنہ دیا۔" سب سے پہلے تم اپنے کروڑپتی دادا سیٹھ امام الدین سے ایک گرانقدر عطیہ وصول کر لو، پھر لوگوں سے فنڈ اکٹھا کرنے کی بات کرو"

" دادا جان کا حوالہ دے کر مجھے شرمندہ مت کیجیے۔ اگر ان تلوں میں تیل ہوتا تو مجھے اس نیک کام کی تکمیل کے لیے آپ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہی کیا تھی —— ؟ میں آپ کے دستِ تعاون کی بھیک مانگتا ہوں —— ان معصوم بچوں کی خاطر جن کے زخمی والدین کی رگوں میں اگر بروقت خون نہ چڑھایا جائے تو وہ یتیم ہو جائیں گے —— ان جوان عورتوں کی خاطر جن کے تڑپتے ہوئے خاوندوں کے جسموں میں اگر بوقتِ ضرورت خون نہ انڈیلا جائے تو وہ بیوہ ہو جائیں گی " ——

لوگ کھسکتے گئے۔ حتیٰ کہ سارا ہال خالی ہو گیا۔

مسٹر ڈین لوگوں کی بے اعتنائی سے مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنی تحریک کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ دل میں ایک نیا عزم لے کر پورے زور و شور سے میدان میں اتر پڑے —— اب وہ کبھی ریلوے اسٹیشن پر مسافروں کو خطاب کرتے ہوئے

نظر آتے تو کبھی عبادت گاہوں میں بلڈ بینک کا رونا روتے دکھائی دیتے ——
ہسپتالوں ، مدرسوں ، دفتروں ، یہاں تک کہ چلتی ہوئی بسوں میں بھی ان کا موضوعِ
سخن ایک ہی ہوتا —— بلڈ بینک مسٹر ڈین کا اوڑھنا بچھونا بن گیا
تھا۔

اس درمیان مسٹر ڈین نے اپنے دولت مند دادا سے مالی تعاون کی
کئی بار درخواست کی مگر سیٹھ امام الدین کے کانوں پر جوں تک نہیں
رینگی — دادا نے اپنے یتیم پوتے کو : صرف آوارہ ، نکما اور دیوانہ
جیسے خطابات سے نوازا ، بلکہ مروجہ دستور کے مطابق اسے وراثت سے
بھی محروم کر دیا۔

یہ قصہ اس زمانے کا ہے جب کینیا پر برطانیہ کی حکومت تھی ، اور
ملک بھر میں ایمرجنسی تھی —— "آزادی کی راہ میں مر مٹیں گے" ——
یہ نعرہ ہر مقامی افریقی کی زبان پر ہوتا تھا - اسی جدّ و جہد کے دوران ایک
سیاسی جلسہ منعقد ہوا تھا ، جس میں مسٹر ڈین نے بھی شرکت کی اور حسبِ
معمول بلڈ بینک کا راگ الاپنے لگے ۔ اس غیر قانونی ریلی کو منتشر کرنے کے لیے
پولیس نے آنسو گیس استعمال کی اور فائرنگ بھی کی ۔ مسٹر ڈین بُری طرح
گھائل ہوئے اور انھیں اسپتال پہنچایا گیا۔ جب سیٹھ امام الدین کو اپنے
پوتے کے زخمی ہونے کی خبر ملی تو وہ دوڑتے ہوئے اسپتال پہنچے اور نرسوں
سے گڑگڑا کر کہا : —— "ابھی تک میری رگوں میں خون باقی ہے ۔ اگر میرا
خون مریض کے کام آسکے تو اسے فوراً دے دو اور اس کی جان بچالو"

"دادا جان ! آپ . . . نے . . . بہت . . . دیر کر دی . . ."
مسٹر ڈین نے بس اتنا کہا اور ابدی نیند سو گئے۔

جب کبھی میں سر مائیکل کرپس میموریل لائبریری سے ملحق سیٹھ امام الدین کی قائم کردہ مسٹر ڈین میموریل بلڈ بینک سے گزرتا ہوں تو بے اختیار منہ سے نکلتا ہے :

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

○○

بھیڑ چال
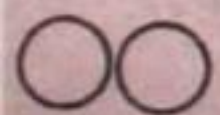
پرائمری اسکول کی کسی کتاب میں ایک کہانی پڑھی تھی، جس کا لبِ لباب کچھ یوں تھا: ——

ایک خرگوش جنگل میں ایک درخت کے نیچے سستا رہا تھا۔ درخت کا پتہ گرنے سے خرگوش ہڑبڑا کر اٹھا اور یہ سمجھ کر کہ آسمان ٹوٹ پڑا ہے وہاں سے

دُم دَبا کر بھاگ نکلا ——— اُسے دوڑتا ہوا دیکھ کر کسی دوسرے جانور نے پوچھا کہ بھئی کیا بات ہے، یوں کیوں بھاگ رہے ہو؟ تو ہانپتے کانپتے خرگوش نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور کہا: ——— "کیا اندھے ہو جو یہ بھی نہیں دیکھ سکتے کہ آسمان ٹوٹ پڑا ہے" ——— آؤ دیکھا نہ تاؤ وہ جانور بھی خرگوش کے پیچھے بھاگ نکلا ——— اس کے بعد یکے بعد دیگرے جنگل کے تمام جانور خرگوش کے پیچھے ہو لیے۔

'بھیڑ چال' کے لغوی معنی ہیں 'بے سوچے سمجھے' دیکھا دیکھی کام کرنا ——— رسم و رواج کے پیچھے اندھا دھند ہو لینا۔

عام طور پر بھیڑ چال انتہائی تباہی اور بربادی کا موجب بن سکتی ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں بیک وقت بھیڑ چال کی کئی مثالیں اُبھر رہی ہیں۔ مگر سردست صرف ایک ہی واقعہ پر اکتفا کروں گا ——— جو نہ صرف سچا ہے بلکہ المناک اور دلچسپ بھی ہے۔

ستمبر ۱۹۷۲ء کا یہ اُن دنوں کا واقعہ ہے جب کہ کینیا کے ہمسایہ ملک یوگنڈہ کی حکومت کی باگ ڈور فیلڈ مارشل الحاج عیدی امین دادا کے آہنی پنجوں میں تھی ——— قتل و غارت گری و ظلم و تشدد کی وارداتیں روزمرہ کا معمول بن چکی تھیں۔ لوگ دہشت اور خوف و ہراس کی حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے ——— یوگنڈہ میں تین تین پشتوں سے بسنے والے ہزاروں ایشیائیوں کو تین مہینے کے اندر ملک چھوڑ کر جدھر جی چاہے جانے کا حکم صادر ہو چکا تھا۔

ملک کی اقتصادی حالت انتہائی پستی تک پہنچ چکی تھی ——— سرحد پر تانزانیا (TANZANIA) کی فوج کے ساتھ آئے دن جھڑپ ہوتی رہتی تھی۔

ملازمت کے سلسلے میں مَیں یوگنڈہ کے دارالسلطنت کمپالہ میں قیام پذیر تھا۔ کمپالہ کی سب سے اونچی اٹھارہ منزلہ عمارت کریسٹیڈ ٹاور کی چوٹی کی منزل پر میرا دفتر ہوا کرتا تھا دوپہر کے کھانے کے وقفے کے بعد مَیں نے اپنے پڑوسی اور ہمارے محکمہ کے لیگل سکریٹری مسٹر کواچ اور ان کی بیوی کو ان کے دفتر کے پاس چھوڑ کر ہم دونوں کریسٹیڈ ٹاور پہنچ گئے۔

آفس پہنچے کوئی آدھ پونہ گھنٹہ ہو چکا ہوگا۔ مَیں اپنی فائلوں کی ورق گردانی میں منہمک تھا کہ میری سکریٹری خلافِ معمول دروازہ پر دستک دیے بغیر آفس میں داخل ہوئی اور صرف یہ کہہ کر" ذرا کھڑکی سے جھانک کر باہر تو دیکھیے" بجلی کی سُرعت سے باہر چلی گئی ——— اُٹھ کر مَیں نے جھانک کر جو دیکھا تو مجھے میری آنکھوں پر یقین نہیں آیا، نیچے سڑکوں پر ایک عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ پا پیادہ لوگ پاگلوں کی طرح ہر سمت دوڑ رہے تھے ——— موٹریں، بسیں، لاریاں، موٹر سائیکل اور سائیکل وغیرہ، ٹرافک کے جملہ قوانین و ضوابط کو توڑتے مروڑتے سڑکوں کے دائیں بائیں ہر طرف جا رہے تھے۔ قیامت کا شور و غل تھا۔ بس وہی آسمان ٹوٹ پڑنے کا گمان ہوتا تھا۔ ہینگر (HANGER) پر لٹکا ہوا کوٹ وہیں چھوڑ کر میں تیزی سے باہر نکلا اور لفٹ کا انتظار کیے بغیر یکلخت دو دو تین تین سیڑھیاں اترنے لگا۔ تین چار منزلیں طے کر چکا ہوں گا کہ معاً مجھے مسٹر کواچ کا خیال آیا۔ انھیں اور ان کی بیوی کو گھر واپس لے جانے کی ذمہ داری میری ہی تھی ———

ابھی میں سیڑھیاں واپس چڑھ رہا تھا کہ مسٹر کواچ تیز تیز قدم نیچے اُترتے دکھائی دیئے ——— گھبراہٹ کے مارے ان کا رنگ فق ہوا تھا۔ چہرے سے وکیل کم اور حراست سے بھاگے ہوئے ملزم زیادہ لگ رہے تھے۔ لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگے: اچھا ہوا مل گئے، ورنہ میں تو آس چھوڑ بیٹھا تھا ——— چلو جلدی گھر چلو۔"

"وہیں تو جارہا ہوں، لیکن پہلے یہ بتایئے کہ یہ بھگدڑ کیسی مچی ہے؟ ——— یہ ہنگامہ کیا ہے؟ ——— سب لوگ یوں دیوانہ وار بھاگ کیوں رہے ہیں؟ ——— "تانزانیا کی فوجوں نے اینٹیبے ائرپورٹ پر قبضہ کرلیا ہے اور اس وقت وہ پورے زور و شور سے کمپالا کی طرف بڑھ رہی ہیں ——— مسٹر کواچ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔" ہماری عافیت اسی میں ہے کہ دشمن ہمیں اپنے محاصرہ میں لے اس سے پہلے ہم جلد از جلد گھر پہنچ جائیں۔"

"مگر مسٹر کواچ ہمیں سب سے پہلے آپ کی بیوی کو ان کے دفتر سے لینا ہوگا۔" میں نے اپنے اخلاقی فرض کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی یاددہانی کی۔

"گولی مارو اسے ——— ادھر اپنی جان کے لالے پڑے ہیں اور تمہیں دوسروں کی پڑی ہوئی ہے۔"

ٹکراتے ٹکراتے ہم بے حد دشوار گزار راہوں سے گزرتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچ گئے ——— مسز کواچ پہلے ہی گھر پہنچ چکی تھیں۔ میرے سب بچے اسکول سے گھر واپس آچکے تھے، بیوی کو ہائی بلڈ پریشر کا دورہ پڑ چکا تھا، مگر اس سے کہیں زیادہ مجھے ایک اور فکر کھائے جارہی تھی ——— ان دنوں میرے ہاں ایک عزیز سیر و تفریح کے لیے ہندوستان سے آئے ہوئے تھے، وہ ابھی تک غائب تھے۔

شام کے چھ بج چکے تھے ——— مگر ان کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ انسانیت کے تقاضے نے جوش مارا اور بیوی بچوں کے لاکھ روکنے کے باوجود میں اپنی پیوجو گاڑی (PEUGEOT) لے کر مہمان کی تلاش میں نکل پڑا ——— انٹیبے ایرپورٹ کمپالہ شہر سے کوئی بائیس تئیس میل دوری پر ہے۔ چنانچہ اگر مسٹر کواج کی رپورٹ صحیح تھی تو اس وقت قدم قدم پر دشمن کی فوجیں مع ٹینکس اور توپیں نظر آنی چاہئیں تھیں، مگر وہاں تو ہو کا عالم تھا ——— یوں لگتا تھا جیسے اس قیامت خیز ہنگامے کے بعد یکایک سارا شہر سو چکا تھا، ہر سو گورستان کا سماں بندھا ہوا تھا۔ دور دور تک (پولیس کی چند ایک گاڑیوں کے علاوہ) کسی چلتی گاڑی کا نام و نشان نہ تھا، البتہ تازہ ترین حادثات کی زد میں آئی ہوئی موٹریں اور بسیں وغیرہ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں ——— کہیں کہیں ان موٹر گاڑیوں کے آس پاس یا سڑکوں کے کنارے خون میں لت پت انسانی جانیں تڑپتی ہوئی نظر آئیں مگر میں اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ ان کی کچھ مدد کر سکتا ——— بہرحال ان نامساعد حالات میں یہ کون سا چھوٹا کارنامہ تھا کہ رات کی سیاہی پھیلنے سے پہلے میں اپنے عزیز مہمان کو ڈھونڈھ کر صحیح سلامت گھر واپس لے آیا تھا!

ابھی قدم گھر میں رکھا ہی تھا کہ ریڈیو یوگنڈہ سے یہ خبر نشر ہوئی کہ تانزانیہ کے حملہ آور ہو کر انٹیبے ایرپورٹ پر قابو پانے کی خبر سراسر غلط اور بے بنیاد تھی۔ کسی شرپسند شخص نے ملک میں انتشار پیدا کرنے کی خاطر یہ افواہ اُڑائی تھی ——— پھر تمام شہریوں سے اپیل کی گئی کہ وہ بغیر کسی خوف و خطر اپنے اپنے کام کی طرف رجوع ہو جائیں۔

دوسرے دن کمپالہ کے تمام کاروبار حسبِ معمول چل رہے تھے۔ مگر گزشتہ روز کی بھیڑ چال کے نتیجے میں جو جانی نقصان ہوا تھا اس کی تلافی کیونکر ہو سکتی تھی؟ ———

OO
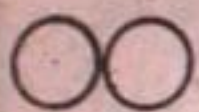
ڈھلتا سورج

پورے تیس سال ادھر کی بات ہے ـــــــ

ایسٹ افریقن پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف ایڈمنسٹریشن میں کلرک کی حیثیت سے
نیا نیا بھرتی ہوا تھا ـــــــ سارا محکمہ مختلف سیکشنز یا آفسوں میں بٹا ہوا تھا۔ مثلاً
سارٹنگ آفس، پارسل آفس، ٹیلی فون آفس، ٹیلی گراف آفس، اسٹور، کاؤنٹر اسٹاف

آفس، اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ — ہر آفس کا ایک انچارج ہوا کرتا تھا اور وہ ہر حالت میں انگریز ہی ہوتا خواہ وہ کتنا ہی نکما کیوں نہ ہو۔

مسٹر رابرٹسن پارسل آفس کے انچارج تھے، جہاں میرا پہلا تقرر ہوا تھا۔ ان کی شخصیت گوناگوں نقوش کا ایک عجیب سا امتزاج تھی۔ درمیانہ قد، فربہ جسم، بھاری بھر کم جسم پر بہت ہی چھوٹا سر، چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے درمیان چھوٹی سی پھولی ہوئی ناک، ایک آنکھ دوسری جنگِ عظیم میں کھو بیٹھے تھے اور غالباً اس عیب کو چھپانے کے لیے وہ ہر وقت کالی عینک لگائے رکھتے — انتہائی کور ذہن مگر عام انگریز کی طرح کم گو اور وقت کے بے حد پابند۔ — ان کے غیر معمولی سائز کے پیشِ نظر اسٹور سے ایک ایکسٹرا لارج سائز کی کرسی منگوائی گئی تھی، جس پر بیٹھ کر وہ اپنا بیشتر وقت گزارتے اور وہیں سے اپنے جملہ فرائض انجام دیتے۔

ایک انگریز افسر اور چند افریقی چپراسیوں اور قلیوں کے علاوہ ہر آفس کا باقی تقریباً سارا عملہ ایشیائی (ہندوستانی، پاکستانی، سیلونی وغیرہ) ہوا کرتا تھا۔ نہ صرف محکمۂ ڈاک کا بلکہ ہر سرکاری دفتر کا یہی ڈھانچہ ہوا کرتا تھا — سول سروس میں ایشیائی کچھ ایسا مرکزی کردار ادا کرتے تھے کہ انھیں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل تھی۔

اُن دنوں پورے مشرقی افریقہ پر برٹش سامراجیوں کی گرفت کچھ اس قدر مضبوط تھی کہ کسی کو یہ گمان تک نہیں ہو سکتا تھا کہ دس بارہ سال کے قلیل عرصہ کے اندر مقامی افریقی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال

ہیں گے ——— اقتدار کے نشے میں مست، انگریز تو اس بھرم میں تھے کہ سارے افریقہ پر تاابد حکومت کرنا ان کا پیدائشی حق ہے، اور ایشیائی (بجز ان مٹھی بھر دور اندیش اور بیدار مغز لوگوں کے جنھوں نے تحریک آزادی میں اپنا پورا پورا حق ادا کیا) حکمراں قوم کا پانی بھر کر رہنے ہی میں اپنی بھلائی سمجھتے ——— وہی مرتا کیا نہ کرتا والی مثال ان پر صادق آتی تھی۔

ابھی ملازمت اختیار کیے مجھے چند ہی دن ہوئے تھے کہ یہ حقیقت مجھ پر وا ہوئی کہ پارسل آفس میں لالہ یعقوب نامی ایک پاکستانی سنیئر کلرک کا طوطی بولتا ہے۔ سارا اسٹاف ان کے اشارے پر ناچتا ——— چھ فیٹ لمبے، نصف عمر کے یہ بھاپرش ہر وقت اپنی دھونس جمانے کی کوشش میں لگے رہتے۔ مقامی زبان سواحیلی سے بالکل ناواقف تھے اور سرکاری زبان انگریزی کچھ اس ڈھب کی بولتے کہ سننے والا ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتا ——— یوسی (YOUSEE) ان کا تکیۂ کلام تھا۔ جب دیکھو لالہ جی مسٹر رابرٹسن کے ارد گرد منڈلاتے رہتے۔ ہر روز پہلے پہر ہاتھ میں باسکٹ اٹھائے مسٹر رابرٹسن کے ساتھ شاپنگ کے لیے جانا ان کا معمول تھا۔ حتیٰ کہ اتوار کی صبح بھی پوسٹ آفس کے نزدیک واقع کیتھولک چرچ کے باہر لالہ جی ہاتھ میں باسکٹ تھامے مسز رابرٹسن کے انتظار میں کھڑے نظر آتے۔ مسٹر اور مسز رابرٹسن کی خدمت گزاری ان کا مقدر بن چکی تھی۔ ——— "یوسی" اگر ان کا تکیہ کلام تھا تو باسکٹ ان کا ٹریڈ مارک تھا۔

لالہ جی صوم و صلوٰۃ کے کوئی خاص سختی سے پابند نہیں تھے۔ ——— البتہ رمضان کے مبارک مہینے میں دن کے وقت اگر مسلمان کے ہاتھ میں سگریٹ دیکھ لیتے تو مارنے

مرنے پر تل جاتے ——— نام ونمود کی خاطر آفس اسٹیشنری کی الماری میں ایک عدد مُصلّیٰ رکھا ہوتا جسے وقت بے وقت اپنے طویل و عریض آفس کے ایک کونے میں تان کر وہ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ شراب عادتاً کبھی نہیں پی مگر صاحبوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پارٹیوں میں ایک آدھ جام ضرور نوش فرما لیتے۔ ویسے صاف گو تھے مگر مصلحتاً جھوٹ بولنے کو بھی بُرا نہیں گردانتے تھے۔

نہ جانے میری کون سی ادا لالہ جی کو اتنی بھائی کہ پہلے ہی روز سے وہ میرے گرویدہ ہو گئے۔ جتنے عرصہ تک میں نے پارسل آفس میں کام کیا وہ ہمیشہ میرے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے ——— ان کے اس غیر متوقع برتاؤ نے بہتوں کو اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔ ایک جونیئر کلرک نے تو حسد کے مارے مجھ سے بات چیت تک ترک کر دی تھی ——— مجھے اس کی مطلق پروا نہ تھی۔ کیونکہ لالہ جی کی نظرِ عنایت کی بدولت مجھے کبھی کبھار اوور ٹائم کرنے کا موقع نصیب ہوتا۔ ان کی اس کرم فرمائی کے صلے میں ہفتے میں دو مرتبہ میں ان کے بیٹے کو پرائیویٹ ٹیوشن پڑھایا کرتا تھا۔

چار مہینے پارسل آفس میں کام کرنے کے بعد میرا تبادلہ ٹیلیفون سیلس آفس میں ہوا ——— پھر کسی تیسرے اور پھر چوتھے ——— البتہ اس تمام عرصے میں مسٹر رابرٹسن اور لالہ جی پارسل آفس میں ہی ٹکے رہے۔ میں بدستور ٹیوشن بھی پڑھاتا رہا، جس کا اب مجھے فیس کی شکل میں معقول معاوضہ ملنے لگا تھا۔

مسٹر رابرٹسن چار سال کی طویل سروس کے بعد عنقریب ہی ریٹائر ہونے

والے تھے ـــــــ چنانچہ ان کے اعزاز میں اسٹاف کی جانب سے ایک الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لیکن پارٹی میں لالہ جی کو شریک نہ پاکر ہر کسی کو تعجب ہوا۔

اگلے روز جب میں ان کے گھر گیا تو خلافِ معمول لالہ جی کو گھر میں پایا۔ بہترین سوٹ میں ملبوس لالہ جی کچھ بے چین سے لگ رہے تھے اور بار بار اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھ رہے تھے ـــــــ میرے سلام کا جواب دیا اور گویا ہوئے :

"کتنی دیر سے مَیں چرن سنگھ کا انتظار کر رہا ہوں مگر ان سکھوں کے جب دیکھو بارہ بجے ہوتے ہیں۔"

"کیوں خیر تو ہے۔ آج کس کی شامت آئی ہوئی ہے؟" ـــــــ مَیں نے چھیڑا۔ ہم ابھی کافی بے تکلف ہو چکے تھے۔

"ہمارے نئے انچارج مسٹر اوڈانگا کا خیر مقدم ایک کاک ٹیل پارٹی سے ہو رہا ہے۔ چرن سنگھ نے چھ بجے تک پک اپ کرنے کا وعدہ کیا تھا، مگر کم بخت ابھی تک نہیں آیا ـــــــ کوئنس ہوٹل تک کوئی قاعدے کا بس روٹ بھی نہیں، ورنہ بس سے ہی چلا جاتا" ـــــــ لالہ جی نے پھر ایک دفعہ گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"لالہ جی! ـــــــ کل آپ کو مسٹر رابرٹسن کی پارٹی میں نہیں دیکھا۔"

میں نے پوچھا۔

لالہ جی نے گھڑی دیکھی اور پھر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے۔۔۔
"دُپیتر ـــــ! تم ابھی تک بچے ہو۔ بھلا ان باتوں کو تم کیا جانو ـــــ
رابرٹسن ایک ڈھلتا ہوا سورج ہے، اب اس کی پوجا کرنے سے کیا
حاصل" ـــــ

OO

قصّے شائستہ لوگوں کا

قومی اجتماع ہو یا کھیل کود کا میدان، شادی بیاہ کا منڈپ ہو یا سوگ و ماتم کا مقام، شبِ برات کی تقریب ہو یا نوراتری کا پروگرام، درس و تدریس کی محفل ہو یا صنعت و حرفت کی نمائش، ہم چاروں دوست ایک ساتھ ہی ہوتے ہیں ——— "چار یار" ——— کہ لوگ ہمیں اسی نام سے یاد کرتے ہیں... کی دوستی ایک مثالی دوستی ہے۔

اتوار کے تیسرے پہر حسبِ معمول ہمارا تاش کا سیشن جما ہوا تھا اچھے بھلے کھیل رہے تھے کہ نہ جانے میرے پارٹنر کو کیا سوجھی ــــــ تجویز فرمایا :

" یار چلو آج ہاکی کا میچ دیکھ آتے ہیں ۔ ورلڈ چمپینس ــــــ (WORLD CHAMPIONS) پاکستان اور کینیا کے درمیان دوسرا ٹیسٹ میچ آج شام کو نیروبی سٹی اسٹیڈیم پر کھیلا جا رہا ہے ۔"

" ہوش کی دوا کرو " ــــــ میری دائیں جانب والے نے فوراً تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ بھول گئے وہ واقعہ جب تین سال پہلے پاکستان ہی کی نیشنل ہاکی ٹیم کو مقامی سیاست کا شکار بن کر واپس جانا پڑا تھا ۔ بے کار وقت ضائع مت کرو اور پتہ پھینک دو ۔"

" یار مجھے تو یہ میچ والا آئیڈیا بہت ہی اپیل کر رہا ہے " ــــــ میں نے اپنے پارٹنر کی حمایت کی ۔ اِٹ شُڈ بی اے تھرلر (IT SHOULD BE A THRILLER)

" وہ تو کل ممباسہ میں کھیلے گئے پہلے ٹیسٹ کے ریزلٹ سے ہی ظاہر ہے " چوتھے نے لقمہ دیا ــــــ مگر شاید عمداً تجویز کے حق میں یا خلاف کسی قطعی رائے کا اظہار نہیں کیا ۔

" ہُرّ ۔ ۔ ۔ ر ۔ ۔ ۔ ر ۔ ۔ ۔ رے " ــــــ پہلا فتح یابانہ انداز

میں چلا اٹھا۔

دو گھنٹے بعد جب ہم چاروں سٹی اسٹیڈیم میں داخل ہوئے تو لوگوں نے تالیوں سے ہمارا سواگت کیا ——— کم از کم ایک لمحہ کے لیے تو ہم نے یہی سمجھا مگر ایک دوسرے ہی لمحے حقیقت کھل گئی جب ہم نے دیکھا کہ عین اسی وقت ڈریسنگ روم سے مہمان ٹیم میدان میں اتر رہی تھی۔ سکھ اور گوان کھلاڑیوں پر مشتمل کینیا کی ٹیم پہلے ہی گراؤنڈ میں موجود تھی۔ تماشائیوں کی اکثریت ایشیائیوں کی تھی... کہیں کہیں انگریز بھی نظر آرہے تھے ——— اس ہجوم میں اگر چند سیاہ فام افریقی دکھائی دے رہے تھے تو وہ تھے وردیاں پہنے ہوئے پولیس کانسٹبل ——— کیسا المیہ تھا یہ کہ میچ افریقہ کی دھرتی پر کھیلا جا رہا تھا اور سماں کچھ ایسا بندھا ہوا تھا جیسے امرتسر کی خالصہ گراؤنڈ پر بھارت اور پاکستان کا مقابلہ ہو رہا ہے۔

اسٹیڈیم کا ٹینس ماحول تین سال پہلے گزرے ہوئے واقعات کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ "کم آن کینیا" "پک اپ کینیا" کے درمیان "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ بار بار ہوا میں گونج رہا تھا ——— ان کے علاوہ چند انتہائی اشتعال انگیز اور فضا کو آلودہ کرنے والے نعرے ہماری سماعت پر بہت ہی گراں گزر رہے تھے، چنانچہ ہم کسی ایسی محفوظ جگہ کی تلاش میں چل پڑے جہاں بدکلامی اور دنگا فساد کے امکانات کم ہوں۔

"چلو ہم وہاں جا کر بیٹھتے ہیں" ——— ایک یار نے دائیں جانب کے اسٹینڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "مجھے اس کیمپ میں چند شائستہ

لوگ دکھائی دے رہے ہیں۔"

اپنی نشست پر بیٹھ کر میں نے ذرا اگردوپیش کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ واقعی جن لوگوں کے درمیان ہم بیٹھے ہوئے تھے ان کا شمار ملک کے شائستہ لوگوں میں کیا جاتا تھا۔

توقع کے مطابق دونوں ٹیمیں بہت ہی عمدہ کھیل کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ ہاف ٹائم پر مہمان ٹیم ایک کے مقابلے میں دو گول سے جیت رہی تھی ——— ابھی کھیل دوبارہ شروع ہونے والا ہی تھا کہ ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے ایک سکھ نے پاس والے انگریز سے سرگوشی کی . . . " یہ پاکی فارورڈ FORWARD کچھ زیادہ ہی تیز لگتا ہے . . ."

" اس کی ایسی کی تیسی . . ." انگریز نے ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے باآوازِ بلند کینیا کے ایک کھلاڑی کو اکسایا کہ وہ گیند کے بجائے اس پاکستانی فارورڈ کے گھٹنوں کو نشانہ بنائے۔

" ذرا ہمت کر کے دیکھ تو لے ——— اگر تمھاری بتیسی توڑ کر نہ رکھ دوں تو مسلمان کا بچہ نہ کہلاؤں ۔" ایک گرجدار آواز نے ہم چاروں کو چونکا ہی دیا۔

تھوڑی دیر کی تُو تُو مَیں مَیں کے بعد انگریز اور مسلمان نے اپنی اپنی آستینیں چڑھائیں اور دونوں ہاتھا پائی پر اُتر آئے۔ اس عرصہ میں سیکنڈ ہاف شروع ہو کر شاید ایک دو مزید گول بھی ہو چکے تھے۔ البتہ کب اور کس ٹیم نے گول کیے اُس کا علم ہمیں اس گتھم گتھی کی وجہ

سے نہ ہو سکا۔ کھیل کا سارا مزہ کِر کِرا ہو چکا تھا۔ چیلنج دینے والے حضرت مسلمان ہائی کورٹ کے ایک جج تھے اور مقابلہ ایک انگریز ریٹائرڈ صوبائی کمشنر سے تھا ——— پاس ہی کھڑے دو پولیس کانسٹیبل بے بس اور مجبور نظر آرہے تھے۔

امپائر نے سیٹی بجائی اور میچ ختم ہونے کا اعلان کیا ——— کھیل کے نتیجے سے بے خبر جس وقت چار یار اسٹیڈیم سے نکل کر کار پارک کی طرف قدم رنجبہ فرما رہے تھے ——— دو شائستہ لوگوں کی کشتی برابر جاری تھی ———!

OO

ھٰذا مِن فضلِ ربّی

میں نے اپنا اٹیچی کیس اُٹھایا اور جھٹ سے اس طرف کو ہو لیا۔ جدھر یہی کوئی تین چار مسافر امیگریشن کے لیے ایک چھوٹی سی کیو بنائے کھڑے تھے —— چاروں طرف سرسری نگاہ دوڑائی تو ایرپورٹ پر ہمیشہ کی طرح خالی خالی نظر آیا —— بلاشبہ تانزانیا کے کوہ کلی منجارو KILIMANJARO کے دامن میں واقع کلی منجارو انٹرنیشنل ایرپورٹ

نہایت ہی حسین و دل کش نظارہ پیش کرتا ہے ——— مگر جب بھی میں یہاں
سے گزرتا ہوں مجھے یہ سوال شدت سے ستاتا رہتا ہے کہ آخر تانزانیا سرکار
نے کروڑوں شلنگ کی لاگت پر اس "سفید ہاتھی" کو کس خوشی میں تعمیر کیا
تھا؟ ——— آج میں وہاں کھڑا اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ میرے ہم سفر
جیٹھا لال تیز تیز قدم میری سمت آتے ہوئے دکھائی دیے ———
پاس آکر کہنے لگے:

"یار گجب ہو گیا" وہ بہت ہی پریشان نظر آرہے تھے۔
جیٹھا لال سے میری جان پہچان اسی سفر کے دوران ہوئی تھی ———
ہم دونوں کے سفر کا آغاز نیروبی سے ہوا تھا، اور دونوں کی منزل بھی
ایک ہی تھی ——— اروشا ہوائی جہاز سے اترنے سے پہلے ہم نے آپس میں
اپنے تعارفی کارڈ ایکس چینج (EXCHANGE) کیے تھے۔ نیروبی میں واقع جیمسٹونس
سینٹر GEMSTONES CENTRE. کے وہ مالک تھے۔

"کیوں کیا بات ہوئی جیٹھا لال ———؟" میں نے تشویش بھری آواز
سے پوچھا۔

"یار سکور بھائی! اپنا کالرا ویکسی نیسن کا پیریڈ اکسپائر ہو گیا ہے۔
اور یہ کالا لوگ اپن کو تین دن کے واسطے کرنٹین (QUARANTINE)
میں رکھنا مانگتا ہے۔"
میرے تعارفی کارڈ پر گو میرا پورا نام عبدالشکور چھپا ہوا تھا۔

جیٹھا لال اپنے مخصوص انداز میں مجھے سکور بھائی کہہ کر پکارتے تھے :

" دوست ! یہ تو بہت بُری خبر سُنائی آپ نے " ـــــــــ میں نے ہمدردی جتلائی ۔

" ایک کام کرو سکور بھائی ـــــــــ اُس سیسے (شیشے) کے تھرو باہر دیکھو تو ـــــــــ وہ آدمی جو گرے سوٹ میں کھڑا پائپ پی رہا ہے نا وہ اپن کو رسیو کرنے آیا ہے ـــــــــ ہم اُس کو ساجی بولتا ہے ـــــ آپ جب باہر نکلو گے نا تو اپنا دکھڑا ساجی کو سُنا دینا ـــــــ بہت پہنچا ہوا آدمی ہے وہ "

باہر آکر گرے رنگ کے سوٹ پہنے ہوئے شخص سے ملنے پر معلوم ہوا کہ ان کا اصلی نام سیّد عبدالرّب شاہ تھا ـــــــ لیکن دُنیا انھیں شاہ جی کے نام سے جانتی تھی ۔

" دیکھیے عبدالشکور صاحب، شہر (اروشا) تک جانے کے لیے آپ کے پاس ٹرانسپورٹ نہ ہو تو بندہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے ـــــــ آپ یہیں تشریف رکھیے، میں ابھی دو منٹ میں جیٹھا لال کی مشکل حل کیے دیتا ہوں " شاہ جی نے پُر اعتماد لہجے میں کہا ۔

" آپ کی آفر کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں ـــــــ لیکن مجھے

لینے کے لیے آپ کے شہر کے پوسٹ ماسٹر صاحب آنے والے تھے ـــــــــ وہ یہیں کہیں ہوں گے" ـــــــــ میں نے ذرا اپنی افسری جمانے کی کوشش کی۔

اس مختصر سی ملاقات میں میں شاہ جی کی باوقار شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا ـــــــــ اگر زندگی نے وفا کیا تو دوبارہ ملنے کے عہدو پیمان کر کے ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

شاہ جی سے دوسری ملاقات کے لیے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا، کیونکہ اسی دن تیسرے پہر وہ جیٹھا لال کے ساتھ جنرل پوسٹ آفس میں ہیڈ پوسٹ ماسٹر کے دفتر میں آدھمکے تھے ـــــــــ جس بے تکلفی سے شاہ جی دفتر میں داخل ہوئے تھے اس سے ظاہر تھا کہ وہ ہیڈ پوسٹ ماسٹر مسٹر رجابو کے دیرینہ واقف کار تھے ـــــــــ جیٹھا لال سے رسمی تعارف کرانے کے بعد شاہ جی نے مسٹر رجابو کو اور مجھے رات کو ان کے اپنے ہوٹل میں ڈنر پر مدعو کیا۔ اور جانے کی اجازت طلب کی ـــــــــ مسٹر رجابو کے ردِ عمل کی پروا کیے بغیر میں نے ہم دونوں کی جانب سے شاہ جی کی دعوت قبول کر لی اور پھر جیٹھا لال کو مخاطب کر کے کہا:

"معلوم ہوتا ہے صبح کرنٹین سے آپ کی رہائی جلدی . . ."

"عبدالشکور بھائی، وہ تو بہت معمولی پرابلم تھی . . ." شاہ جی نے میری بات کاٹتے ہوئے احتیاطاً انگریزی کی بجائے ہندوستانی میں کہا۔ "بس کا

نوٹ کالیداس (افریقی) کے ہاتھ میں تھما دیا اور چلتے بنے۔"

میں نے نوٹ کیا کہ اس دوران مسٹر رجابو بالکل خاموش، سر کو کرسی کی پشت پر ٹکائے بیٹھے تھے، پھر ان دونوں کے جانے کے بعد گویا ہوئے:

"مسٹر تنکور! آپ کے آج رات کے میزبان کی قسمت اچھی تھی۔ جو آپ یہاں موجود تھے ـــــــ اگر آپ کا لحاظ نہ ہوتا تو میں اس کمینے کو دھکے دے کر باہر نکالتا۔"

"آئی ایم سوری مسٹر رجابو! ـــــــ غالباً آپ اس شخص کو برسوں سے جانتے ہیں۔ ہماری جان پہچان تو خیر چند گھنٹوں کی ہے۔ ڈنر کی دعوت کو لینے سے پہلے آپ کی رضا مندی میرا فرض بنتا تھا، لیکن مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں دوبارہ معافی چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں، مگر آپ اس آدمی سے ذرا دور ہی رہیں تو بہتر ہوگا۔ آپ شوق سے ڈنر اٹینڈ کریجیے مگر مجھے معاف رکھیے میں نہیں آسکوں گا" ـــــــ
اس کے بعد ہم اپنے اپنے کام میں جٹ گئے۔

شام کو جب مسٹر رجابو اپنے فوکس ویگن میں بٹھا کر مجھے ہوٹل تک لے جارہے تھے، تو میں نے ان سے شاہ جی سے متعلق کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی ـــــــ مسٹر رجابو بھی کچھ سننے سنانے کے موڈ میں تھے،

کہنے لگے :

" ہم تینوں ——— شاہ جی ، آپ اور مَیں مسلمان ہونے کے ناطے عالم گیر برادری کے بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں۔ صرف ایک فرق کے ساتھ ——— افریقی ہونے کے سبب میرا رنگ آپ دونوں سے قدرے سیاہ ہے۔"

یکایک مسٹر رجابو نے بریکس پر پاؤں رکھے اور موٹر کو ایک لمحے کے لیے روک کر کہا۔ ۔ " بائی دی وے ربانی ہوٹل کے علاوہ وہ سامنے جو سینما گھر نظر آرہا ہے شاہ جی اس کے بھی مالک ہیں ——— دارالسلام میں بھی ان کا ایک سینما گھر ہے۔" پھر کچھ وقفے کے بعد۔ ۔ " شاہ جی ان میں لوگوں میں سے ہیں جو ہر جائز و ناجائز طریقے سے مال و متاع کو سمیٹ لیتے ہیں اور پھر اس خدا داد دولت کو دل کھول کر راہِ خدا میں صرف بھی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا کام بظاہر بڑا خوش آیند دکھائی دیتا ہے لیکن اس کا نتیجہ خسارہ ہی خسارہ ہے ——— یہ وہ لوگ ہیں جن کے قدم دنیوی دولت و قوت، شوکت و سطوت کی حرص میں غلط راہوں پر پڑ جاتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی طرف سے یہ سمجھتے ہیں کہ بڑے نیک کام کر رہے ہیں ——— مَیں جس دولت مند طبقے کا ذکر کر رہا ہوں وہ اپنے متعلق بلا تامل یہ کہہ دیتا ہے کہ اس پر " اللہ کا بڑا فضل ہے۔"

اتنی دیر میں ہم ہوٹل تک پہنچ چکے تھے۔ مسٹر رجابو کی فاضلانہ باتوں نے مجھے ایک جھٹکے میں آسمان سے اٹھا کر زمین پر ٹپک دیا تھا ——— اللہ اللہ کیا

جادو تھا ان کی باتوں میں ——— انھوں نے اپنی کار ایک طرف پارک کی ۔ اور سلسلۂ کلام جاری رکھا :

" آپ میری فضول باتوں سے کافی بور ہو چکے ہوں گے ۔ لیکن آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ تمہید بہت ضروری تھی ——— ہاں تو شاہ جی کا شمار اس شہر کے نہ صرف رؤسا میں کیا جاتا ہے بلکہ سماجی اور دینی رہنماؤں میں بھی ان کا نام سرِ فہرست ہے ۔ اگر جدید اصطلاح میں ناجائز منافع خوری ، گراں فروشی ، ذخیرہ اندوزی اور اسمگلنگ وغیرہ کا نام تجارت ہے تو شاہ جی اس معیار پر پورے اُترتے ہیں ——— ان کے بزنس کنکشنس دور دراز تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ وہ مقامی لائنس کلب کے گورنر ، والڈ لائف سوسائٹی کے سیکریٹری اور جامع مسجد کمیٹی کے چیرمین ہونے کے علاوہ اسی قسم کے کئی اور اداروں سے وابستہ ہیں ۔ حال ہی میں میونسپل کونسل کے الیکشن میں پانی کی طرح پیسہ بہاکر ناکام رہے ۔"

مسٹر رجابو ایک لمحے کے لیے رُکے اور پھر کہنے لگے . . . " کبھی ایک مزیدار قصہ سناؤں ——— پچھلے سال کا واقعہ ہے ، شاہ جی میرے دفتر میں آئے اور اپنے ایک دوست کے گھر ٹیلی فون لگوانے کی سفارش کی ۔ پھر انھوں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ برآمد کیا اور میرے آگے بڑھایا ——— لفافے میں اپلی کیشن کے علاوہ سَو سَو کے دس نوٹ بھی بند تھے ——— اس روز میں نے شاہ جی کو وہ سنائیں کہ وہ پسینہ پسینہ ہو گئے ——— ان کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ایک مسلمان بھائی ہونے کے رشتے میں نے انھیں پولیس

کے حوالے نہیں کیا۔"

رات کی سیاہی پھیلنے لگی تھی۔ مسٹر رجابو نے اگلی صبح آنے کا وعدہ کیا اور چلے گئے ـــــــ کوئی ایک گھنٹہ بعد شاہ جی کا ڈرائیور مجھے ان کے ہوٹل تک ڈنر پر لے جانے کے لیے آیا۔

شاہ جی کے ربّانی ہوٹل میں قدم رکھا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ سامنے شیشوں کی شیلف میں مختلف قسم کی شرابوں کی بوتلیں قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔ چند گاہک کھانے پینے میں مصروف تھے۔ دور ایک کونے میں بچھی ہوئی ایک میز کے اطراف چار پانچ دوشیزائیں شراب نوش فرما رہی تھیں۔ ان کے ظاہری میک اَپ سے وہ کوئی شریف زادیاں نہیں لگ رہی تھیں۔ بائیں طرف جیٹھا لال ایک موٹی سی انگریز عورت کے ساتھ بات چیت کرنے میں مشغول تھے۔ دائیں طرف کاؤنٹر کے پیچھے ایک غیر معمولی اونچی کرسی پر شاہ جی براجمان تھے۔ اور شاہ جی کی پشت کی دیوار پر ایک بہت ہی قیمتی تختی لٹک رہی تھی جس پر سنہری حرفوں میں لکھا تھا:

هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ

یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے

○○
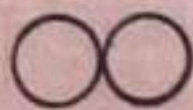
ایسا بھی ہوتا ہے

ڈور بیل (DOOR BELL) کی آواز نے مجھے جگا دیا ——— "اوہیل!
ان لوگوں نے تو نیند حرام کر دی ہے" ——— میں بڑبڑاتا ہوا اُٹھا۔ اور
آنکھیں ملتا ہوا زینے سے نیچے اُترنے لگا ——— ہنگامے سے بھرپور نیروبی
کے اس شاپنگ سینٹر میں واقع ایک فلیٹ میں رہتے ہوئے اب ہمیں پورے پانچ
سال ہو چکے تھے۔ نیچے دکان، اوپر مکان، اس لحاظ سے بڑی سہولت تھی۔ مگر

ہماری پڑوسن کی آئے دن کی کھٹ پٹ نے جینا محال کر دیا تھا۔

"اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آؤ"—— اس زرّیں قول کے تحت ہم کڑوے گھونٹ پیتے رہے۔ بیگم نے دو ایک مرتبہ دبی زبان میں کچھ کہہ بھی دیا تھا کہ بچّوں کی پڑھائی کی خاطر ہمیں اس شور و غل سے نکل کر کہیں اور جا کر رہنا چاہیے —— مگر وقت گزرتا گیا اور ایک ایک کر کے ہمارے دونوں بچّے تعلیم سے فارغ بھی ہو گئے۔

آدھی رات گئے یوں ہڑبڑاتے ہوئے جاگ اٹھنا میرا معمول سا ہو گیا تھا۔ ہماری افریقی پڑوسن کے ملاقاتی اکثر ہمارے ہی دروازے پر لگے ہوئے سوئچ پر انگلی رکھتے —— چنانچہ مَیں نے دروازہ کھولے یا کچھ کہے بغیر ہی اِن اَن دیکھے ملاقاتیوں کی رہنمائی کرتے ہوئے کہا:

"بھئی! —— ساتھ والے دروازے پر دستک دو۔ اور خواہ مخواہ پریشان مت کرو۔"

"مَیں ہوں انکل! دروازہ کھولیے" —— ایک جانی پہچانی آواز فضا میں گونجی۔

دروازہ کھولا تو سامنے نیلو (نیلوفر) کھڑی تھی۔ اس کی گود میں اس کا نوزائیدہ بیٹا تھا۔

"نیلو تم؟ . . . اور اس وقت . . . !" مَیں نے اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لیتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔ "کیا بجا ہے؟"

"میری گھڑی ابھی تک لندن کا وقت بتا رہی ہے ——— اس کے مطابق گیارہ بجے ہیں - یہاں اب ایک بج رہا ہوگا۔" نیلو نے ٹیکسی والے کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا -

"نہ خط نہ تار نہ فون !" مَیں نے شکایت کی -

"انکل ! ——— مَیں آپ کو سرپرائز SURPRISE دینا چاہتی تھی ۔"

"چلو چھوڑو اس قصّے کو ابھی" ——— مَیں نے سوٹ کیس سٹنگ روم کے فرش پر رکھا - پھر نیلو اور اس کے ننھے کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ "سب سوئے پڑے ہیں - اگر تم اپنی آنٹی کو جگانا چاہتی ہو تو آواز دو اسے ، ورنہ سو جاؤ اس خالی چارپائی پر - صبح اٹھ کر مل لینا سبھوں سے ۔"

نیلوفر ممباسا میں مقیم وقار حسن کی بھتیجی اور اکلوتی بیٹی تھی ——— اس سے بڑے اس کے جڑواں بھائی اور اس کی ماں ایک کار ایکسی ڈنٹ میں اس وقت جان کھو بیٹھے تھے جب اس کی اپنی عمر صرف دو سال کی تھی - وقار حسن سے میری پہلی ملاقات پندرہ سال پہلے ہوئی تھی ، جب ہم وکٹوریا نامی ایک بحری جہاز میں بمبئی سے ممباسہ تک ہم سفر تھے ——— اُچھلتی ، کودتی اور ہر وقت مسکراتی نیلو اس وقت بھی کوئی سات آٹھ سال کی ہوگی -

"اس حادثہ جاں کاہ سے لے کر اب تک میں نیلو کے معصوم پیار کے سہارے جی رہا ہوں" ——— وقار حسن نے اپنی دکھ بھری کہانی ختم کرتے ہوئے کہا تھا -

ہم جلد ہی گھل مل گئے ——— اور ہماری سرسری جان پہچان ایک پُرخلوص دوستی میں بدل گئی ۔ تین سو میل کی دُوری ہمارے رشتے کو کمزور نہ کر سکی ——— اگست کی تعطیلات نیلو ہمارے یہاں آکر گزارتی ، اور دسمبر میں ہم سب ممباسہ چلے جاتے ——— دو سال پہلے نیلو ابھی اے لیول ('A' LEVEL) کے امتحان سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ لندن میں مقیم اس کے چچا زاد بھائی سے اس کی شادی ہو گئی ۔

پچھلے دسمبر میں جب ہم حسبِ معمول ممباسہ گئے تو وقار حسن کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی ۔ وہ بیٹی کی یاد میں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے ——— ان کا لینڈز اور اسٹیٹ ایجنسی کا اچھا بھلا کاروبار ایک قلیل عرصہ میں بالکل ماند پڑ گیا تھا ۔ اور وہ خود اکثر گھر ہی میں پڑے رہتے ۔

"تم نے یہ کون سا روگ لگا رکھا ہے وقار ؟ ——— کیوں بھولتے ہو کہ نیلو اب پرائی گھر کی ہو گئی ہے ؟" میں نے ڈانٹا " ——— اگر یہاں تمھارے اکیلے کا جی نہیں لگ رہا ہو تو بوریا بستر باندھو اور چلو میرے ساتھ نیروبی آکر رہو" ۔

"نہیں میرے بھائی ! ——— اب تو صرف میری ایک ہی خواہش ہے ، مرنے سے پہلے میں اپنی بٹیا کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں ——— تم جانتے ہو نیلو عنقریب ہی ماں بننے والی ہے ۔ ایک مرتبہ لندن سے خوش خبری آجائے تو میں وہاں جاکر زچہ اور بچہ دونوں کو دیکھ آؤں گا ۔"

اور نیلو جب اچانک پہنچ گئی تو میں نے سوچا ، کتنی چاہت ہے باپ اور بیٹی

ہیں ۔ ـــــ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی ـــــ چنانچہ صبح اُٹھتے ہی پہلے میں نیلو کے لیے ممباسہ کے سفر کا ٹکٹ لے آیا۔

"ناشتہ سے فارغ ہو کر پہلے اپنے ڈیڈی کو فون کر کے بتا دو کہ تم دوپہر کی کوسٹ بس سروس سے آرہی ہو۔ بس رات کے لگ بھگ آٹھ بجے تمھیں گھر پر اُتار دے گی" ـــــ میں نے نیلو کے ہاتھ میں ٹکٹ تھماتے ہوئے کہا۔

"نہیں انکل، پلیز! ـــــ میں ڈیڈی کو بھی سرپرائز دینا چاہتی ہوں" اُس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

بس چڑھاتے وقت میں نے نیلو کو تاکید کی کہ خیریت سے پہنچنے کے بعد فون کرے اور چند دن ممباسہ میں گزار کر اپنے ڈیڈی کے ساتھ نیروبی آجائے تاکہ لندن واپس لوٹنے تک وہ یہیں ہمارے پاس رہے۔

دوسرے دن کی دوپہر تک جب ممباسہ سے فون نہیں آیا تو میں نے خود وقار حسن کا نمبر گھمایا۔ گھنٹی بج رہی تھی مگر کوئی رسیور اُٹھا نہیں رہا تھا۔ اس طرح کافی رات گئے تک میں ناکام کوشش کرتا رہا اور پھر سو گیا ـــــ پورے ایک بجے ڈور بیل کی آواز نے میری نیند توڑ دی اور میں پڑوسن کو صلواتیں سُناتا ہوا نیچے اُتر آیا۔ دروازہ کھولا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ نیلو اپنے بچے کے ساتھ مجرم بنی سامنے کھڑی تھی ـــــ اس کی دائمی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے غائب تھی۔ مگر وہ خوف زدہ نہیں تھی ـــــ اس کے چہرے سے صورتِ حال کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔

"میں کل کی فلائٹ سے واپس لندن جانے کے لیے آئی ہوں" نیلو نے

صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی کوئی سرپرائز تھا کیا؟" ——

"جی نہیں انکل! —— دراصل بات یہ ہے کہ پچھلی رات جب میں ممباسہ پہنچی تو گھر کے باہر تالا لگا ہوا پایا۔ پڑوسیوں کی زبانی پتہ چلا کہ میرے پہنچنے سے ایک گھنٹہ پہلے ڈیڈی ممباسہ سے ڈائرکٹ فلائیٹ کے ذریعہ لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ پڑوسیوں کے کہنے کے مطابق انھوں نے اپنی روانگی کی کسی کو بھی اطلاع نہیں دی —— وہ مجھے "سرپرائز" دینا چاہتے تھے۔۔"

OO

نیکی کا صلہ جو اُسے مِلا

کویت سے آئے ہوئے ایک مہمان کے اعزاز میں ہم میاں بیوی ایک مشترکہ رشتہ دار کے ہاں کھانے پر مدعو تھے ـــــــ ہمارے میزبان مسٹر اور مسز ارشاد نیروبی کے اُس علاقے میں سکونت پذیر تھے جہاں ایشیائیوں کا دولت مند طبقہ کثرت سے آباد تھا ـــــــ ان کے عالیشان بنگلے سے ملحق سرونٹس کوارٹر میں جیمز جیرو عرف جے جے رہا کرتا تھا ـــــــ

جے جے اُن لوگوں کا کافی پرانا نوکر تھا۔

عشائیہ سے فراغت پاکر ہم تینوں مرد لاونج میں بیٹھے گپ شپ ہانک رہے تھے ـــــ جے جے ڈائننگ ٹیبل پر رکھی ہوئی خالی پلیٹیں وغیرہ ہٹانے میں مشغول تھا۔

" میں نے کہا جی ذرا نوکر پر بھی نظر رکھیے ورنہ تھالیوں میں بچا کھچا سب ہڑپ ہو جائے گا" ـــــ باورچی خانہ سے بیگم ارشاد نے چلّا کر کہا۔ وہ اپنے خاوند سے اُردو کی بجائے اپنی مادری زبان میں مخاطب تھیں حالانکہ عام طور پر اُن کی آپس میں اُردو میں ہی گفتگو ہوا کرتی تھی۔
" ہماری بھابیِ صاحبہ بھی کمال کرتی ہیں ـــــ گویا آپ کا ملازم اردو زبان سمجھ لیتا ہے۔ اس لیے یہ احتیاط برتی جا رہی ہے" ـــــ مجھ سے رہا نہیں گیا۔

" چھوڑیے جی ـــــ ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ یہ بدھوا گر اتنے ذہین ہوتے تو ہم پردیسی ہو کر ان سے غلامی کیوں کرواتے؟ ـــــ ہمیں یہ نوکر چاکر کیسے نصیب ہوتے؟ ـــــ ہماری یہ شان و شوکت اور یہ ٹھاٹ سب ان کی کند ذہنی کی بدولت ہی تو ہے ـــــ خدایا اِن عقل کے ماروں کو سدا یونہی گم صُم رکھ تاکہ ہماری آن بان میں کوئی فرق نہ آنے پائے" ـــــ مسٹر ارشاد دست بدعا ہوئے۔
" واقعی آپ لوگوں کی آسودہ حالی قابلِ رشک ہے" ـــــ مہمان

گویا ہوئے ——— "ہم خلیج میں رہنے والے ہندوستانی و پاکستانی جس ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتے ہیں آپ اُس کا تصور بھی نہیں کر سکتے ——— پیٹ کی خاطر ہم لوگ مجبوراً عربوں کی عیاشی میں ان کے معاون و مددگار بنے ہوئے ہیں ——— سچ تو یہ ہے کہ ایسی رزق سے موت اچھی۔"

"جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" ——— میں نے گویا کوزے میں دریا بند کر دیا۔

اس اثناء میں بیگم ارشاد سنگتروں اور کیلوں سے بھری ہوئی ایک ٹرے لے کر آئیں اور میری بیوی کو ایک صوفے پر اپنے پاس بٹھاتی ہوئی شکایتی لہجے میں کہا ——— "میرے خلاف کیا باتیں ہو رہی تھیں جی؟ ہم ایشیائی اِن افریقیوں کو بُدھو، گنوار، احمق، بے ایمان، غیر مہذب اور نہ جانے کن کن ناموں سے یاد کرتے ہیں ——— میں کہتی ہوں یہ ہمارا خیالِ خام ہے۔ برطانوی سامراجیوں سے تو خیر یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی محکوم رعایا کو علم و ہنر سے آراستہ کرتے اور انھیں دوسری اقوام کے شانہ بشانہ چلنے کے مواقع فراہم کرتے . . ."

"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی" ——— میں نے قطع کلامی کی۔

"بالکل ——— اب جبکہ وہی افریقی پچھلے اٹھارہ اُنیس سالوں سے ایک آزاد ملک میں سانس لے رہے ہیں، کس خوش اسلوبی سے تمام امور کو سرانجام

دے رہے ہیں ــــــ البتہ جنھیں کیڑے نکالنے کی عادت ہی پڑی ہے وہ کبھی نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں آئیں گے ۔"

"تم نے تو چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا دیا ــــــ بات چلی تھی گھر کے نوکر کی اور اس کی ابتدا بھی کچن ہی سے ہوئی تھی ۔" مسٹر ارشاد نے اپنی بیگم کی یاد دہانی کی ۔

بیگم ارشاد ایک لمحے کے لیے کچھ جھینپ سی گئیں مگر فوراً سنبھل گئیں ۔ "مانا کہ خوراک ہمارے نوکر کی کمزوری ہے ــــــ جہاں کہیں کوئی کھانے کی چیز دیکھ لیتا ہے، ضرور ہاتھ مارتا ہے ۔ اس کے علاوہ میں نے اس میں کوئی اور عیب نہیں دیکھا ۔"

"بیگم اگر بُرا نہ مانو تو میں یہی کہوں گا کہ تم نے اپنے نوکر کو سر چڑھا رکھا ہے ــــــ سودا سلف خریدنے کے لیے بائیسکل دے رکھی ہے ۔ بن ٹھن کر جس ٹھاٹ سے سائیکل پر سوار گیٹ سے باہر نکلتا ہے دیکھنے والے کو یہی گمان ہوتا ہوگا کہ وہ ہمارے ہی کنبے کا ایک فرد ہے ــــــ تم ہی تو بتا رہی تھیں کہ وہ احسان فراموش ایک دفعہ تم سے کہہ رہا تھا کہ جب ہم ملک چھوڑ کر اپنے بچوں کے ساتھ آسٹریلیا جا کر رہیں گے تو وہ اس گھر کا مالک بنے گا ــــــ ہوں! یہ مُنہ اور مسور کی دال ــــــ اُس کا اگر بس چلے تو وہ آج ہی ہمیں اس گھر سے چلتا کرے ۔"

"معاف کیجیے مسٹر ارشاد ــــــ اس وقت کیوں نہ ویڈیو پر وہ پاکستانی

ڈرامہ دیکھا جائے جس کا ابھی چند منٹ پہلے آپ نے ذکر کیا تھا۔" میں نے موضوع گفتگو بدلنے کے لیے یہ تجویز رکھی تھی اور یوں بھی سنیچر و اتوار کی درمیانی شب ہونے کی وجہ سے دوسرے دن علی الصباح اُٹھ کر کام کاج میں جُٹ جانے کی کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ ڈرامے میں ہم اس قدر محو ہو گئے کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔

پورے دو بجے مہمان اور ہم زوجین گھر واپس لوٹنے کے ارادے سے مسٹر ارشا کی کار پورچ کی طرف جا رہے تھے تو معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نیروبی کی فضا میں وہ خاموشی وہ سناٹا نہیں تھا جو عام طور پر آدھی رات گزر جانے کے بعد ہوا کرتا ہے۔ ہر سمت سے گولیاں چلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سڑکوں پر کچھ غیر معمولی ٹریفک تھی۔ دُور، بہت دُور، زمین و آسمان لرزا دینے والا لوگوں کا شور و غل تھا جو ہر لمحے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ ہم تینوں ٹھٹک کر رہ گئے۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اب مسٹر اور مسز ارشا دبھی گھر سے باہر نکل آئے تھے۔ ہم سبھوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ "یہ حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔ کوڈیٹا (COUP DETAT) ہے۔" اُن حالات میں موٹر چلا کر گھر جانے کی کوشش کرنا بہت بڑا خطرہ مول لینے کے برابر تھا۔

ظالمین کی للکار اور مظلومین کی آہ و بُکا کے درمیان رائفلوں اور مشین گنوں کی آوازوں سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ جسم کانپ کانپ رہا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ لوٹ مار کی جو اطلاعات موصول ہو رہی تھیں ان سے ظاہر تھا کہ لٹیروں نے شہر کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا اور وہ ایک ایک کر کے خصوصاً ان گھروں اور دُکانوں کا جن کے مالک ایشیائی تھے، صفایا کر رہے تھے۔ ریڈیو کی نشریات کے مطابق باغیوں نے سرکاری ریڈیو اور ٹیلی وژن اسٹیشن اور محکمۂ ڈاک و ٹیلی گراف پر قبضہ کر لیا تھا۔

وہ ایک خوفناک اور قیامت خیز رات تھی جسے یاد کر کے سارا وجود لرزا اُٹھتا ہے۔

فوج کے چند باغی افسروں نے کینیا کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ موقع سے فائدہ اُٹھا کر اشتعال پسند اور امن دشمن عوام نے باغیوں کی مدد سے نیروبی میں لوٹ کھسوٹ کا جو بھیانک منظر پیش کیا تھا اُسے آسمان کی آنکھ نے شاید ہی پہلے کبھی دیکھا ہوگا۔ آزاد مشرقی افریقہ کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کوئی ملک اس قسم کے ہنگاموں سے دوچار ہوتا ہے تو سب سے پہلے برق گرتی ہے تو برِ صغیر کے اُن لوگوں پر جو ایشیائی کہلاتے ہیں اور جو پشت در پشت لگ بھگ ایک صدی سے یہاں رہتے بستے ہیں۔

لٹیروں کا ہجوم جب بہت ہی قریب پہنچا تو ہم سب گھر کے اندر جاکر سجدہ ریز ہو گئے۔ اُس کے بعد صبح سورج طلوع ہونے تک ہم کسی اور ہی دُنیا میں بسے رہے۔ اچانک میری آنکھ جو کھلی تو مَیں نے دیکھا کہ مسٹر ارشاد اور جے، جے باہر پھاٹک کے پاس کھڑے تھے۔ نہمان کو ساتھ لے کر ڈرتا ہوا مَیں بھی ان کے قریب جاکر کھڑا ہوا۔ گیٹ پر بدستور قفل لگا ہوا تھا مگر مسٹر ارشاد کے نام کی تختی کی بجائے وہاں جے، جے کے نام کی وہ تختی آویزاں تھی جو ہمیشہ سرونٹس کوارٹر کے دروازے کی زینت بنی رہتی تھی۔ یہ جے، جے کا ایک ایسا کارنامہ تھا جس نے لٹیروں کو غلط راہ پر ڈال دیا تھا اور اس طرح مکان اور مکین سب ان کی لوٹ مار سے محفوظ رہے تھے۔ ہم نے گرد و نواح پر نظر دوڑائی تو بیشتر مکانات کی حالت پکار پکار کر گزشتہ رات کی جگر سوز داستاں سُنا رہی تھی۔

جب جے، جے اپنے نام کی تختی گیٹ سے ہٹا کر اپنے آقا کے نام کی تختی لٹکانے کے لیے آگے بڑھا تو مسٹر ارشاد نے اسے روکا اور اُس کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کہا:
"جے، جے، میرے بھائی، وہ تختی اب وہیں رہے گی اور ہم میاں بیوی مستقبل قریب میں آسٹریلیا جاکر اپنے بچوں کے ساتھ رہیں گے۔۔۔"

○○

دُھوپ چھاؤں

گو ہم دونوں نے رات بھر ممباسہ سے نیروبی تک ایک ہی کوچ میں سفر کیا تھا ہمارے تعلّقات علیک سلیک سے آگے نہ بڑھ پائے تھے۔ مَیں نے بہتیرا چاہا کہ وہ کچھ اپنے بارے میں مجھے سُنائے اور کچھ میں لن ترانی کروں تاکہ لگ بھگ چودہ گھنٹوں کی مسافت آسانی سے طے ہو جائے ——— مگر اُس نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔

مَیں بھی چاروناچار اپنی کتاب میں کھوگیا تھا۔

دوسرے دن گاڑی جب نیروبی ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو جھٹ سے اُتر کر مَیں اپنے بظاہر انتہائی مغرور اور کج اخلاق ہم سفر سے دُور بھاگنا چاہتا تھا کہ میری نظر طاہر پر پڑی —— طاہر میرا لڑکپن کا ساتھی ہونے کے علاوہ ہم وطن بھی تھا —— ہندوستان میں جس گاؤں میں مَیں نے جنم لیا تھا اسی گاؤں سے طاہر کے آبا و اجداد وابستہ تھے —— یہ بات اور تھی کہ طاہر نے اپنا آبائی وطن کبھی دیکھا ہی نہ تھا کیونکہ اُس کے والد ذاکر بابا پہلی جنگِ عظیم کے بعد جو سمندر کے اس پار آئے تو مڑکر واپس نہیں لوٹے —— وہ عین جوانی میں کینیا (مشرقی افریقہ) آئے، ایک افریقی عورت سے دل لگایا اور اِدھر ہی کے ہو کر رہ گئے۔

"طاہر" ——! مَیں تقریباً چیخ پڑا۔ مگر قبل اس کے کہ آگے بڑھ کر مَیں اُس سے بغل گیر ہوتا، مَیں نے دیکھا کہ وہ اُسی شخص سے ہاتھ ملا رہا تھا جس کا روکھا پن پچھلے چند گھنٹوں سے میرے لیے ایک اذیت کا باعث بنا تھا —— مَیں نے پلٹنا چاہا مگر میری آواز سن کر طاہر نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔

"کیوں برادر کہاں بھاگ رہے ہو؟" —— طاہر نے میرا ایک بازو پکڑ کر حسبِ معمول سواحیلی زبان میں سوال کیا —— پھر میرے

جواب کا انتظار کیے بغیر کہا "—— ان سے ملیے یہ ہیں میرے بڑے بھائی ظاہر —— کمپالہ میں رہتے ہیں یہ"
"ہیلو" بے دلی سے مَیں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

سامنے کھڑا ظاہر اب میرے لیے ایک سراپا معمّہ تھا —— اگر واقعی وہ طاہر کا حقیقی بھائی تھا تو اُن دونوں میں ہرگز اتنی مشابہت نہیں تھی جو 'ط' اور 'ظ' میں پائی جاتی ہے۔ زمین آسمان کا فرق تھا دونوں میں۔ میرے اچنبھے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ اگر طاہر اُردو زبان سے بالکل ناواقف تھا تو ظاہر کو مَیں نے گزشتہ روز ممباسہ ریلوے اسٹیشن پر کسی سے نہایت شستہ اُردو میں باتیں کرتے سُنا تھا —— اس وقت سے لے کر ابھی تک ایک بات جو مَیں نے خصوصی طور پر نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ اس تمام عرصہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی ظاہر کے سر سے ٹوپی نہیں ہٹی تھی۔ اب جو مَیں نے اُسے بہ نظرِ غائر دیکھا تو سارا پول کھُل گیا —— چند گھنے گھنگھرالے بال ٹوپی کے اندر سے جھانک کر اس حقیقت کا انکشاف کر رہے تھے کہ ٹوپی پہننے والا اپنا سر نہیں ڈھانپ رہا تھا بلکہ اپنی شناخت پر پردہ پوشی کر رہا تھا۔

طاہر کے اشارہ پر ہم تینوں ایک ٹیکسی میں بیٹھے —— ٹیکسی انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کے پاس رُکی جہاں ظاہر کو پہلے ڈراپ کیا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے میرے غریب خانہ پر چھوڑ دیا گیا۔
اس واقعہ کو بہت دن ہو چکے تھے مگر مَیں طاہر اور ظاہر کے خون کے

رشتے کی گتھی کو ابھی تک سلجھا نہیں سکا تھا ——— ایک دن طاہر کی اماں کی بیماری کی خبر پاکر میں عیادت کے لیے اس کے گھر پہنچا۔ وہ جھونپڑی نما گھر شہر کے ایک خستہ حال علاقہ میں واقع تھا جہاں صرف افریقی آباد تھے ——— طاہر کے بوڑھے والدین کے علاوہ گھر میں دو جوان بہنیں اور بال بچے رہتے تھے ——— مریضہ کی طبیعت قدرے سنبھل چکی تھی۔

"طاہر کو ماں جی کی بیماری کی اطلاع دی ہے کیا؟" ——— بیشک میں نے جان بوجھ کر طاہر والا موضوع چھیڑا تھا مگر میں نہیں جانتا تھا کہ میرا یہ سوال دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کے مترادف ہوگا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ کس کا نام لیا تم نے بٹیا" ——— پھر ایک آہ بھر کر ذاکر بابا نے کہا "——— اُس جیسی نکمّی اولاد خدا اگر کسی کو نہ دے تو ہی بہتر ہے" ——— اُس کے بعد ذاکر بابا کی آنکھوں سے جھڑی جاری ہوگئی، اور وہ آگے کچھ کہہ نہ سکے ——— قریب ہی کھڑے طاہر نے مجھے بلاکر پاس والے کمرے میں بٹھا دیا اور کہا "——— اُس دن کی ہماری ملاقات کے بعد تم کافی دیر تک حیران و پریشان رہے ہوگے برادر"

"تم سولہ آنے صحیح کہہ رہے ہو ——— میری تو راتوں کی نیندیں حرام ہوگئی ہیں اس معمّے کا حل ڈھونڈتے ڈھونڈتے ——— آخر تم اپنے بھائی کو یوں چھپا کر کیوں رکھتے ہو ——— اُس کے بارے میں

جاننے کا مجھے کچھ حق نہیں ہے کیا؟"

" ضرور، کیوں نہیں ــــــ بات یوں ہے کہ ابھی ظاہر بھائی یہی کوئی تین چار سال کے ہوں گے کہ بابا نے انھیں ہمارے دادا جان کے پاس اپنے آبائی وطن ہندوستان بھیج دیا ــــــ میں تو اُس وقت پیدا ابھی نہیں ہوا تھا۔ بھائی وہیں پروان چڑھے۔ تھوڑا بہت پڑھ لکھ بھی گئے ــــــ پھر دادا جان نے اپنی ہی برادری میں ان کی شادی کرادی ــــــ جب بھائی اِس ملک میں واپس لوٹے تو وہ ایک ایسے سانچے میں ڈھل چکے تھے کہ خود کو ایشیائی سمجھ کر ہمیں افریقی ہونے کے ناطے حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے ــــــ ہم بھائی بہنوں کی بات ہی اور تھی وہ تو اس عورت کو جس کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے اپنی ماں ماننے کے لیے تیار نہیں تھے" ــــــ

طاہر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ــــــ

" وہ ہم سے الگ تھلگ رہتے، اور بالآخر ایک دن نیروبی چھوڑ کر کمپالہ جا بسے تاکہ ہم لوگوں کا سایہ تک اُن پر نہ پڑ سکے" ــــــ پھر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے طاہر نے سلسلۂ کلام جاری رکھا:

" برادر تم جانتے ہی ہو کہ اُن دنوں مشرقی افریقہ پر انگریزوں کی حکومت تھی ــــــ اور کینیا، یوگنڈا اور تانزانیا کے درمیان فری آمد و رفت تھی ــــــ یوگنڈا جا کر بھائی نے خوب پیسہ کمایا مگر ان کی پھوٹی کوڑی تک کبھی ماں باپ کو نصیب نہیں ہوئی ــــــ جس تنگدستی میں ہم پلے بڑھے ہیں وہ کوئی تم سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے ــــــ

بھائی صاحب جب بھی اپنے کاروبار کے سلسلے میں نیروبی آتے ہیں، شاندار ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں —— البتہ پچھلے دو سالوں سے کبھی کبھار چپکے سے میرے گھر آکر ہم لوگوں سے ملنے ضرور لگے ہیں۔

جب سے مشرقی افریقہ آزاد ہوا ہے حالات تیزی سے بدل رہے ہیں —— ہم افریقیوں کے جائز حقوق ہمیں ملتے جارہے ہیں —— انشاء اللہ اب وہ دن دُور نہیں جب ہمارے بھی دن پھر جائیں گے —— ہم ایک ایسا کینیا بنائیں گے جہاں نسلی امتیاز کا نام ونشان نہ ہوگا —— ایک ایسا معاشرہ قائم کریں گے جہاں اولاد اپنے والدین کا احترام کرے گی —— اور ایک بھائی دُوسرے بھائی کے دُکھ درد میں شریک ہوگا —— کیوں برادر ہو گیا حل تمھارا معمہ؟" ——

پانچ سال بعد یوگنڈا سرکار نے ایشیائیوں کو اپنے ملک سے نکال کر دربدر کر دیا ——

ایک دن پناہ گزینوں سے لدی ہوئی کمپالہ ٹرین سے ظاہر صاحب روتے پیٹتے اپنے اہل وعیال سمیت نیروبی کے

پلیٹ فارم پر اُترے تو وہ بالکل خالی ہاتھ تھے —— طاہر نے اُن سبھوں کو اپنی مرسیڈیز MERCEDES گاڑی میں بٹھایا اور حال ہی میں خریدے ہوئے اپنے خوشنما بنگلے میں منتقل کر دیا ——

○○

گلڈ کی
اشاعتی کارکردگی
کا
اجمالی جائزہ
وقت کی صدیاں (شاعری) داؤد غازی ۱۹۷۰ء -/۴ (نایاب)
شعاعِ اوّل (شاعری) مہرور دلوی مرحوم ۱۹۸۱ء -/۲۰
مہاراشٹر کی تہذیبی اور ادبی قدریں (جائزہ) بدیع الزماں خاور - ۱۹۸۲ء -/۲۰
لہو کے چراغ (شاعری) انجم عباسی ۱۹۸۴ء -/۲۰
چہکر (شاعری) شاکر بانکوٹی ۱۹۸۴ء -/۲۵
لمحے لمحے کا کرب (شاعری) پرویز بانی ۱۹۸۵ء -/۲۰
مرآۃ المعرفت (شاعری) عارف سیمابی بانکوٹی ۱۹۸۵ء -/۴۰
کوکن کے سپوت (انٹرویوز) انجم عباسی / شیخ اسماعیل ۱۹۸۶ء -/۴۰
نئی تحریریں (تنقیدی تحقیقی مضامین) ڈاکٹر عبدالستار دلوی ۱۹۸۶ء -/۵۰
اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو (تنقید) ڈاکٹر یونس اگاسکر ۱۹۸۷ء -/۸۰
ڈھلتا سورج (افسانے) شیخ اسماعیل ۱۹۸۷ء -/۳۰
KOKAN URDU WRITERS GUILD

KOKAN URDU WRITERS GUILD
کوکن اردو رائٹرس گلڈ